وَاَنزَلنَا اِلَيكَ الذِّكرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيهِم

سہ ماہی

البیان کراچی

سلسلہ نمبر 8 جولائی تا ستمبر 2013، رمضان تا ذوالقعدہ 1434

فہرست مضامین

زرتعاون شمارہ | 70 روپے، سالانہ بکنگ پر خصوصی رعایت | بیرون ملک | زرسالانہ 12 ڈالر، فی شمارہ 3 ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)

Bank Al-Habib A/C No:1103-0081-002746-01-2 تفصیلات کے لئے 03333574685

المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر

AL-Madina Islamic Research Center

مسجد سعد بن ابی وقاص ڈیفنس فیز 4، 11 کمرشل اسٹریٹ
نزد شار شہید پارک وگذری پولیس اسٹیشن کراچی

Ph:+92-21-35896959
Mob 03322135693

WEBSITE:
WWW.ISLAMFORT.COM

E-MAIL:
albayanmirc@gmail.com

اداریہ

عوام اور علماء کرام میں خلیج

اسباب اور علاج

خالد حسین گورایہ

الحمدللہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ

بلا کسی طویل تمہید کے نفس موضوع پر آتے ہوئے ہم یہ کہنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ اس وقت معاشرے کی شکست وریخت، تنزلی وانحطاط، بے راہ روی اور شتر بے مہاری کے جہاں دیگر اسباب ہیں وہاں مرکزی سبب اہل علم اورعوام الناس کے مابین وہ خلیج اور فاصلہ ہے جسے پُر کرنے کیلئے دونوں طبقوں کی جانب سے کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روحانی امراض میں اضافہ ہوتا رہا، جہالت بڑھتی چلی گئی۔اہل علم کی زبانوں پر شکوہ سننے کوملتا ہے کہ عوام علماء کی قدرداں نہیں !اورعوام کہتے ہے اہل علم کو ہمارے مسائل سے سروکار نہیں!۔

بڑا طویل عرصہ ہوا ہے اس کشمکش کوشروع ہوئے، دوریاں بڑھتی جارہی ہیں، بدظنی، بے یقینی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔اس اختلاف کا نقطہ آغاز جاننے کیلئے ہمیں آج سے کچھ تین چار صدیاں پیچھے جانا ہوگا۔ اس وقت مسلمان جس تہذیب کے دلدادہ ہیں وہ تہذیب ان کی نہیں غیروں کی ہے۔اس کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ آج سے تین چار صدیاں قبل کا زمانہ یورپ میں بادشاہ، جاگیردار اور پوپ کے ظالمانہ اقتدار کے خلاف شدید ترین ردعمل کا زمانہ تھا جس کے نتیجے میں بادشاہت اور جاگیرداری نظام کا مکمل خاتمہ ہوا۔ پوپ جو مذہبی نمائندہ تھا اس کے کردار کو گرجے کی چاردیواری تک محدود کردیا گیا۔پوپ کو گرجے تک محدود کرنے کے بعد اجتماعی معاملات سے مذہب کے کردار کو ختم کرکے گرجے تک محدود کردیا گیا، مذہب اور اس کے احکامات پر عمل کرنا شخص کے ذاتی اور پرائیوٹ مسئلہ قرار دیا گیا اور طے یہ کردیا گیا کہ سوسائٹی اپنے اجتماعی معاملات خود ہی طے کرے گی اسے کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔اس صورت حال کے نتیجے

میں ''سیکولرزم'' کے نام سے ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو کہ ردعمل تھا پوپ اور جاگیرداری و بادشاہی نظام کے ظلم واستبداد کا۔ اس سیکولر فکر کو اس وقت مزید تقویت ملی جب مغرب میں صنعتی اور اقتصادی انقلاب آیا اور اس کے ذریعے سے مغرب دنیا پر حکمرانی کیلئے نکل کھڑا ہوا۔ مسلمان مملکتوں کو محکموم بنانے کے بعد اس نے بنیادی طور پر دو کام کئے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے قدیم نظامِ حکومت اور نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور دوسرا ان پر معاشی معاشرتی اور سیاسی طور پر وہ نظام مسلط کئے جو انہوں نے اپنے کند ذہن اور کچے تجربات کی روشنی میں تشکیل دئے تھے۔ نظام حکم اور نظام تعلیم کی تبدیلی اور معاشرتی وسائنسی علوم کے طوفان کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ سوچ بٹھا دی گئی کہ اگر آگے بڑھنا ہے تو ان علوم کو پڑھنا ہے، ترقی کیلئے یہ جدید علوم ناگزیر ہیں۔ اگر یہ حاصل نہ کئے گئے تو مسلمان دنیا میں سب سے پیچھے رہ جائیں گے۔ الغرض پھر حادثہ فاجعہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی تہذیب، تمدن، روایات ورسومات سب کو ان علوم پر قربان کردیا۔ اپنی زبانیں بدل لیں، ثقافت کو دیس نکالا دے دیا، مذہب کو مسجد و مدرسہ تک محدود کردیا۔ اب اس کے بعد مسلمان دو طبقات میں بٹ گئے ایک وہ طبقہ جن کی آنکھوں کو جدید تہذیب کی چکا چوند خیرہ کئے ہوئی تھی انہوں نے اپنا معاشرتی کردار بلند کرنے کیلئے ان مغربی افکار کا سہارا لیا۔ جبکہ دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے اپنے مذہب، اپنی قدیم روایات، وثقافت اور عقائد کی حفاظت کو اپنا ہدف بنایا۔ یہ دو راستے تھے اگرچہ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ مسلم معاشرے اور ثقافت کو ترقی دینا مضبوط کرنا مگر راہیں جدا ہونے سے ترجیحات بدل گئیں، جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے وہ اپنے معاشرے وتہذیب سے کٹتے چلے گئے۔ زبانیں تک بدلیں، لباس، رنگ ڈھنگ، چال ڈھال، بناؤ سنگار سب کچھ امپورٹ کیا۔ جب اس جداگانہ سفر کا آغاز ہوا تھا تو کافی عرصے تک اس طبقے میں مذہبی وثقافتی باقیات زندہ رہیں لیکن جیسے جیسے نئی نسلیں آئیں اور پرانی عہد پارینہ کا حصہ بنیں تو یہ خلیج بڑھتی چلی گئی نئی نسلیں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو جو قدیم روایات اور مذہب سے جڑے ہوئے تھے انہیں اجنبی سمجھنے لگیں۔ جدید نظام نہ صرف ان کے دلوں میں گھر کر گیا بلکہ لوگوں کو اس کی دعوت دینے اور پرچار بھی کرنے لگے۔ چلتے چلتے بات یہاں تک آن پہنچی کہ مذھب کو ملاّ ازم کہنا شروع کردیا کوئی بھی شرعی بات آتی ہے تو کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ یہ مولویوں کی داستانیں ہیں۔ مذھب کو پرائیویٹ زندگی تک محدود کردیا گیا۔ پانچ وقت کی نماز اور سال میں ایک بار زکوۃ دے لینا ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ پہلے معاشرے، معیشت، بازاروں سے دین نکلا، پھر گھروں سے بھی نکل گیا اور اب ذات اور پرائیویٹ زندگی سے بھی نکل چکا ہے۔ آج وہ مساجد و مدارس میں محصور ہے اور یہاں بھی دنیا کی

سیاست ڈیرے جمائے ہوئے ہے۔ ادھر دوسری طرف کے لوگ جنہوں نے مذہبی اور قدیم اسلامی روایات کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا تھا انہوں نے کنارہ کشی اختیار کرلی معاشرہ سے انہیں زیادہ سروکار نہ رہا، بس کہیں نکاح، یا جنازہ پڑھانے کی ضرورت پڑی تو حاضری دے دی، اگر کسی نے دکان کھول لی تو وہاں قرآن کو چند گھنٹوں میں ختم کرنے پہنچ گئے کسی نے مسئلہ پوچھ لیا تو ٹھیک ہے ورنہ مسجد ہے مدرسہ ہے اللہ اللہ خیر سلا۔

حاصل کلام یہ کہ جس طرح قوم نوح میں بت پرستی کا آغاز ہوا تھا اسی انداز سے مغربی افکار اور مغربی علوم نے علماء اور عوام، دینی و دنیاوی طبقات میں تفریق پیدا کردی۔ جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ قوم نوح میں بت پرستی کے آغاز سے متعلق فرماتے ہیں: ''قوم نوح کے نیک افراد جب مر گئے تو شیطان نے ان کے عقیدت مندوں کو کہا کہ ان کی تصویریں بنا کر تم اپنے گھروں اور دکانوں میں رکھ لو تا کہ ان کی یاد تازہ رہے اور ان کے تصور سے تم بھی ان کی طرح نیکیاں کرتے رہو۔ جب یہ تصویریں بنا کر رکھنے والے فوت ہوگئے تو شیطان نے ان کی نسلوں کو یہ کہہ کر شرک میں ملوث کردیا کہ تمہارے آباء تو ان کی عبادت کرتے تھے جن کی تصویریں تمہارے گھروں میں لٹک رہی ہیں، چنانچہ انہوں نے ان کی پوجا شروع کردی۔''[1]

بالکل اسی طرح جدید مغربی تہذیب نے ایسا وار کیا کہ مسلمانوں کے جس طبقے نے مغربی نظام میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا کہ اس کے ذریعے اسلام کی خدمت کی جائے اسلامی معاشرے کو دنیا کے مقابلے میں لایا جائے!۔ یہ سوچ ان میں اس وقت تک رہی جب تک اس سوچ کے افراد زندہ تھے جب وہ فوت ہوگئے تو شیطان نے ان کی اولادوں کے ذہنوں میں بات ڈال دی کہ مذھب اور مولوی ازم سے تمہارا کیا سروکار تمہارے اباؤ اجداد کی ترقی کا راز تو مغربی تہذیب ومغربی افکار میں پنہاں ہے۔ یہی تمہارے اباء واجداد کی ترقی کا باعث تھا لہٰذا تم جتنا اس راستے پر آگے چلتے جاؤ گے ترقی کی منزلیں طے کرتے جاؤ گے۔

دوسری طرف کا جو طبقہ تھا اس کے اخلاف یہ سمجھنے لگ گئے کہ ہمارا کام تو بس مسجد میں امامت، مدرسے میں تدریس تک محدود ہے۔ باہر نکلے تو قرآنی خوانی اور چہلم میں شرکت کرنا ہی کافی ہے۔ اسی سے انقلاب آئے گا یہیں سے دنیا بدلے گی۔ الغرض اس طبقہ کی قربانیوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور یقینی طور پر جو راہ انہوں نے اختیار کی بڑی اعلیٰ وارفع راہ تھی جس نے برصغیر پاک وہند میں اور دیگر استعمار سے متاثرہ ریاستوں میں علم کو، اسلام کو زندہ رکھا، مغربی تہذیب وثقافت کے تند وتیز حملوں اور طلاطم خیز موجوں کا

---

[1] صحيح بخاري، حديث:4920

ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ہم یہ بات بڑے ہی عزم اور یقین سے کہتے ہیں کہ برصغیر میں اگر مدرسے نہ ہوتے تو یہاں اسلام ہندومت اور مغربی ثقافت میں دب جاتا۔ یقیناً اس طبقہ کی بڑی جلیل القدر خدمات ہیں اور تمام امت اس کی معترف ہے۔

ہم کیسے تیراک ہیں جاکر پوچھو ساحل والوں سے
خود تو ڈوب گئے لیکن رخ موڑ دیا طوفانوں کا

لیکن ان کامرانیوں، کاوشوں اور ان کے بیش بہا نتائج کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ عوام اور علماء، دین اور دنیا میں پیدا ہونے والی خلیج میں یہ طبقہ بھی دانستہ یا نادانستہ حصہ دار ضرور ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس طبقہ کی معاشرے سے جزوی یا کلی کنارہ کشی کے نتائج یہ نکلے کہ مغربی فکر نے تمام معاشرہ کو زہر آلود کردیا، زمانے کی زبان بدل گئی، اصطلاحات بدل گئیں، رہن سہن کے طور طریقے بدل گئے۔ اب صورت حال یہ ہو چلی ہے جس کا نقشہ ''ماہنامہ الشریعہ'' کے ایک مضمون نگار نے بہت ہی عمدہ پیرائے میں کھینچا ہے۔ موصوف علماء اور مذھبی طبقہ سے متعلق کہتے ہیں: ''یہ حضرات اپنے دامن میں حق بھی رکھتے تھے اور حق کی حفاظت کے سب دلائل بھی ان کے پاس تھے، مگر زبان و ماحول کی اجنبیت، لب ولہجہ کا فرق اور مروجہ اصطلاحات سے ناواقفیت کی بنا پر سیکولرزم کے علمبرداروں سے تو دور تھے ہی، معاشرے کے عام سمجھ دار افراد کی فکر اور سوچ کو بھی زیادہ متاثر نہ کرسکے اور عوام کا جتنا کچھ تعلق انکے ساتھ رہ گیا تھا، وہ بھی محض عقیدت کی بنیاد پر تھا''[1] لہٰذا سیکولر لوگوں کا وہی مطالبہ تھا جو مغرب میں پوپ سے کیا گیا تھا کہ اپنا دائرہ عمل مسجد و مدرسہ تک محدود رکھو اور مذہب کو سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے علیحدہ رہنے دو۔

الغرض یہ داستاں بہت طویل ہے اسباب دونوں طرف موجود ہیں اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر اہل علم اور عوام دونوں چاہتے ہیں کہ اسلام پھلے پھولے، معاشرہ دوبارہ قرون اولیٰ کے خطوط پر استوار ہوجائے تو دونوں طبقوں کو ان اسباب کا تدارک کرنا ہوگا جو فریقین کے مابین دوری کا باعث بنے ہیں ان کے ازالے سے اور عوام اور علماء کے ادب واحترام کے رشتے کی مضبوطی سے ہی دین ترقی کرسکتا ہے ورگرنہ ہم سب عنداللہ پکڑے جائیں گے۔ کیونکہ امت دراصل دو طرح کے لوگوں کی اقتداء کرتی ہے۔ علماء اور امراء دین کے معاملے میں لوگ علماء کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ علماء اسلام کی قولی یا عملی جیسی بھی تصویر پیش کرتے ہیں عوام اسی کی تابع ہے اور دنیاوی امور مثلاً سواری، گھر، جائداد، طعام وغیرہ میں ہماری قوم کی

---

[1] ماہنامہ الشریعہ، جلد ۱۹ شمارہ ۶ جون ۲۰۰۸

خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا معیار امراء کا معیار ہو۔اس لئے استعماری سازشوں نے اہل علم کو بدنام کیا اور امراء کو عیاشیوں اور شاہ خرچیوں پر لگادیا۔

اب یہاں اہل علم کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جہاں مسائل ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے عوام الناس کے سامنے خالص عملی اور علمی کردار پیش کیا جائے، تاکہ یہ خلیج کم سے کم ہو اور عوام ایک مرتبہ پھر سے علماء کے حضور دوزانوں ہوکر بیٹھ جائیں۔

زیر نظر تحریر میں ان بنیادی اسباب کی جانب توجہ مبذول کرانے کی سعی کی گئی ہے جن کے تدارک اور اصلاح سے علماء اور عوام، دین اور دنیا میں قائم ان فاصلوں کو ختم یا کم کیا جاسکتا ہے۔قبل اس کے کہ اسلامی تشخص ہماری تہذیب وثقافت سے کلی طور پر کہیں مٹ ہی نہ جائے۔اسباب چونکہ دونوں طبقات میں موجود ہیں لہٰذا اول اہل علم سے متعلقہ اسباب ذکر کریں گے بعد ازاں عوام سے متعلق۔باللہ نستعین و علیہ نتوکل

اہل علم طبقہ کی جانب سے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)اخلاص کی کمی:

اخلاص اعمال میں وزن پیدا کرتا ہے، اخلاص کے فقدان سے عمل کی رنگ آمیزی یا تو پھیکی پڑ جاتی ہے یا بدنما ہوجاتی ہے۔دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ علم کے شعبے کو بھی گویا کہ نظر لگ گئی ہے اہل علم کا لبادہ اوڑھ کر ایسے لوگ اس شعبے میں درآئے ہیں کہ جن کے مقاصد کچھ اور ہیں الا من رحم ربی آج کے علماء اور ماضی کے علماء میں موازنہ کریں تو یہ بات شدت سے کھٹکتی ہے کہ آج کے علماء میں اخلاص کی شدید کمی پائی جاتی ہے۔اخلاص عمل کی روح ہے، جسے ہم نے ثانوی درجے کے جھگڑوں میں الجھ کر گنوادیا ہے۔یہ جھگڑے تنظیمی، جماعتی، منصبی اور ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دعوت دین کو بے پناہ نقصان پہنچتا ہے۔اداروں کی انتظامیہ سے الجھاؤ اور انتظامیہ کی بے معنیٰ دخل اندازی نے ایسے بھیانک نتائج جنم دئے ہیں کہ ملکی سیاست کا اثر دینی اداروں میں نظر آنے لگا ہے۔جو باتنخواہ ہیں وہ تنخواہ کا رونا روتے ہیں اور جو اہل تجارت ہیں وہ وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔تنخواہ دار عالم سمجھتا ہے کہ یہ ذمہ داریاں نظماء کی ہیں اور تجارت پیشہ علماء کا خیال ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داریاں ان ائمہ، دعاۃ اور مدرسین کی ہیں جو اس پیشے سے منسلک ہیں۔

(۲) داعیانہ اوصاف کی کمی:

علماء چونکہ انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کی سب سے بنیادی ذمہ داری دعوت وتبلیغ تھی۔ آج کے دور میں اہل علم طبقہ میں دعوت کا تصور عملاً اتنا محدود ہو گیا ہے کہ وہ مدرسے کی چار دیواری سے نکل کر مسجد کے منبر تک محدود ہو جاتا ہے۔ جبکہ مسجدوں اور مدرسوں میں نہ آنے والے افراد کی تعداد یہاں آنے والوں کی نسبت کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں بسنے والے، مساجد ومدارس سے کٹے ہوئے ان افراد کی رہنمائی کون کرے گا؟ اور انہیں مسجدوں تک کون لیکر آئے گا؟ قصور ان کا بھی ہے اور قصور علماء ودعاۃ کا بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غیر ضروری چیز جس کی ایجاد ایک کمپنی کرتی ہے اس کا اتنا پرچار کرواتی ہے کہ لوگ اسے ضروری خیال کرنے لگتے ہیں اور پھر وہ ان کی زندگی کا ایک لازمہ بن جاتی ہے۔ مگر شریعت جیسی ضروری چیز پر چار نہ کرنے کی وجہ سے غیر ضروری شئ بن کر رہ گئی ہے پھر جب شریعت غیر ضروری ٹھہرے گی تو بھلا علماء کی ضرورت کیونکر محسوس ہو گی اور علماء بیزاری پاؤں کیوں نہ پسارے گی۔

اگر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کس انداز اور کن کن لوگوں کو دعوت دی۔ علماء چونکہ انبیاء کے وارث ہیں ان کی دعوت کا مرکز ومحور ہر وہ شعبہ ہونا چاہئے جسے رسول اللہ ﷺ نے دعوت کیلئے اختیار کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ

{ وَأَرۡسَلۡنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا } [النساء: 79]

ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے

رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں کو یہودیوں، عیسائیوں، منافقین، مجوسیوں کو، ہر جابر وظالم کو، اقرباء کو، عورتوں، جوانوں، بچوں، مریضوں، تاجروں، فقراء کو، بدوؤں کو، غرض ہر ایک کو دعوت دی۔

اور انبیاء نے ہر مقام پر دعوت دی۔ قید خانوں میں دعوت دی یوسف علیہ السلام کا جیل میں دعوت دینا، رسول اللہ ﷺ کا ثمامہ بن اثال کو دعوت دینا اس کی واضح مثال ہے۔ انبیاء نے ایوانِ اقتدار میں دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرمایا: { اذۡهَبَآ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ } [طہ: 43] فرعون کی طرف جاؤ وہ حد سے گذر چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جعفر رضی اللہ عنہ کو دربار نجاشی میں دعوت کے لئے بھیجا۔ آپ ﷺ نے پہاڑوں پر دعوت دین دی جبل صفا پر چڑھ کر اپنی پوری قوم کو پکارا۔ آپ نے یہودیوں کی عبادت گاہوں میں انہیں دعوت دی۔ گھروں میں، لوگوں کی مجالس میں، میلوں اور بازاروں

میں، وفود کو، حج وعمرہ اور دیگر خاص مواقع پر، راستے میں چلتے پھرتے، سفر میں، قبرستان میں، الغرض انبیاء اوران کے اصحاب نے ہر مناسب جگہ دعوت دین کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ [1]

(۳) شرعی علوم میں عدم تعمق:

ہم جس دور میں بس رہے ہیں یہ ایسا دور ہے جس میں فتنوں کی یلغار ہے۔جس میں شہوات کے ساتھ شبہات کا فتنہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔آئے روز نت نئے عقائد ونظریات کا وجود میں آنا علماء کی ذمہ داری اس حوالے سے بڑھا دیتا ہے کہ وہ اس سب کے لئے تیار ہوں۔مکّاروں کی چالوں کو سمجھیں۔ان فتنوں کی بیخ کنی کریں۔اس سب کیلئے شرعی علوم میں تعمق اور ملکہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ کتنے ایسے داعی تھے جو غیروں کی اصلاح کیلئے نکلے اور علمی ناپختگی کے باعث خود فساد اور گمراہی کا شکار ہو گئے۔فرمان الٰہی ہے

{قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ } [یوسف: 108]

آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے، میں اور میرے پیروکار اللہ کی طرف بلا رہے ہیں، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں نہیں۔

لہٰذا دعوت کیلئے بصیرت کی ضرورت ہے اور بصیرت علم میں تعمق سے حاصل ہوتی ہے۔لہٰذا عموما دیکھا گیا ہے بہت سے طلباء علمی بے بضاعتی کے سبب مناظرات ومباحثات میں کود پڑتے ہیں اور مخالف کی چرب زبانی کے باعث شکست کھا کر لوگوں کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔لہذا اس وقت جہاں علماء اور عوام کے مابین رشتے کو مضبوط کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے وہیں بہت سے علوم میں تمکّن حاصل کرنے اور انہیں دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ابتدائی ادوار کے فتنے بڑی مضبوطی سے اٹھے تھے لیکن جب ان کا مایہ ناز علماء سے پالا پڑا تو جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ان کے منطقی وعقلانی دلائل انہیں کی موت کا باعث بن گئے،جس کی بنیادی وجہ اس وقت کے علماء کے علم کی مضبوطی اوران کا ہرفن مولا ہونا تھا۔ اس لئے جب عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ: ''ان موضوع ومن گھڑت روایات کا کیا بنے گا؟ (جو دشمنان اسلام نے دسیسہ کاریوں سے کتب حدیث میں داخل کردی ہیں)۔آپ فرمانے لگے۔اللہ

---

[1] دعوت دین کے حوالے سے فاضل عالم دین پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ کی کتابیں (۱) ''دعوت دین کسے دیں''؟ (۲) ''دعوت دین کہاں دی جائے''۔ملاحظہ کریں اپنے موضوع میں انتہائی معتبر کتب ہیں جزاہ اللہ خیرا۔

تعالیٰ ان کیلئے بھی ماہرین (نقاد وحذاق) پیدا فرمادے گا (جو خبیث کو طیب سے الگ کردیں گے)''۔

عصر حاضر میں اسی کم علمی کی بنا پر بڑے بڑے مسائل پر جرأت سے رائی زنی کرنے والوں کی کثرت ہے۔اس خطرے کے پیش نظر اہل علم فرماتے ہیں: ''لو سکت من لا یعلم لسقط الخلاف''.یعنی جس کو مسئلہ معلوم نہیں ہے وہ اگر خاموش رہے تو اختلاف خود بخود ختم ہوجائے۔سلف سے منقول ہے کہ: ''إن أحدكم ليفتي في المسألة لو وردت على عمر لجمع لها اهل بدر'' تم ایسے ایسے مسائل میں بات کرنے کی جرأت کرتے ہو کہ اگر عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ مسائل پیش ہوتے تو وہ ان کے حل کیلئے اہل بدر کی جماعت کو جمع کرتے۔''

الغرض عصر حاضر میں علماء کی تعداد کم ہے اور قیل وقال کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔یہ بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔جاہلوں کے علماء کی صف میں ہونے سے علماء کی ساکھ مجروح ہورہی ہے۔

(۴) معاشرتی روایات اور ثقافت سے لاعلمی:

ایک داعی کیلئے فقہ الواقع کا عالم ہونا انتہائی ضروری ہے۔اپنے ماحول سے واقفیت کے بعد ہی ایک عالم دین کی دعوت مؤثر ہوسکتی ہے۔ماحول سے واقفیت کو بعض لوگ غلط پیرائے میں لے جاتے ہیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ ایک داعی اور عالم دین کو اپنے معاشرہ میں موجود لوگوں کی عادات، ان کی نفسیات، اور معاشرہ میں درآنے والے منحرف افکار کا علم ہونا چاہئے اور مداخل الشیطان سے بھی بخوبی واقف ہوتا کہ معاشرے کی اصلاح علی وجہ بصیرت کرسکے۔

عربی میں قاعدہ متعین ہے کہ: ((الحكمُ على الشيءِ فَرعٌ عَن تَصَوُّرِهِ))
کسی چیز پر حکم لگانے سے قبل اس کا مکمل تصور ذہن میں ہونا ضروری ہے۔

شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ولا يَتحقَّق ذلك إلا بمَعرفةِ [الواقِع] المحيطِ بالمسألَةِ المرادِ بَحثُها؛ وهذا مِن قَواعدِ الفُتيا بِخاصَّةٍ، وأصولِ العلمِ بعامّةٍ".

مسئلہ کا حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زیر بحث مسئلے سے متعلق ماحول کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے، یہی فتویٰ کا قاعدہ ہے اور یہی علم کا عمومی اصول ہے۔

(۵)اصلاح کو ناممکن سمجھنا:

دعاۃ و مصلحین پر موجودہ معاشرہ میں ایک مایوسی کی فضا طاری ہے۔اس لئے وہ دعوت وہیں دیتے ہیں جہاں انہیں یقین ہو کہ یہاں سے کچھ پذیرائی ملے گے، یا کم ازکم کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوگی۔لیکن یہ سوچ سراسر منہج انبیاء کے خلاف ہے۔دعوت دین معاشرے کے ہر فرد کیلئے ہے چاہے وہ جرم کی دنیا میں کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو۔اس لئے بڑے بڑے گلوکار اور گلوکارائیں، حکّام وولاۃ، بیوروکریٹ لوگوں، اور مخالف فرقے کے لوگوں کو دعوت ہی نہیں دی جاتی یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں یہ بہت آگے نکل چکے ہیں۔اس سوچ کو بدلنا پڑے گا۔اسلاف کی ایک سنت ہے کہ وہ ولاۃ امر کو نصیحت کیا کرتے تھے، ان کے ساتھ خط وکتابت جاری رکھتے تھے کہ کبھی نہ کبھی اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب فرمادے گا۔بادشاہوں کو اصلاحی خطوط لکھنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، اسلاف کا طریقہ ہے۔ہمارے معاشرے میں بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سنت کو جاری کیا جائے۔ٹی وی پر جو منحرف اینکر لادینیت پھیلا رہے ہیں انہیں خط لکھے جائیں، ای میلز کی جائیں۔حکّام وولاۃ، ججز و دیگر کو بھی نصیحتی پیغامات ارسال کئے جائیں۔ناامیدی شرعاً حرام ہے ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ہندہ کا واقعہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کیا پتہ اللہ تعالیٰ کس کو کس وقت ہدایت نصیب کردے۔اس لئے ضرورت اس امر کی ہے علماء کی دعوت کا دائرہ وسیع ہوتا کہ عوام اور علماء میں احترام وادب اور اطاعت کی فضا قائم ہوسکے۔

عوام میں پائے جانے والے علماء سے دوری کے محرکات

ا۔بے دینی:

ذرائع ابلاغ میں آزادی کا جو پروپیگنڈہ ہے اس سے متاثر ہوکر لوگ اتنا آزاد ہوگئے ہیں کہ دینی پابندی بھی ان کو کھلنے لگی ہے کھانے پینے سے لے کر سونے جاگنے اور معیشت ومعاشرت تک میں اسلام کے کچھ اپنے اصول ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ان آزاد طبع مغرب کے غلاموں کو ناگوار ہے۔علاوہ ازیں الحاد ولادینیت، ہندومت، یہودیت، بہائی و پارسی نیز بدھست اور عیسائی مشنریاں ذہنوں میں ہمہ وقت زہر گھولنے کو تیار بیٹھی ہیں جس کا نتیجہ مذہب بیزاری اور علماء بیزاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔[1]

[1] http://thefreelancer.co.in

۲: معاشرے میں دینی و دنیاوی نام سے طبقاتی تقسیم :

اسلام میں سب کچھ دین ہے۔ اگر دنیا ہے تو وہ بھی دین کے تابع ہے، انسان کی تخلیق کا مقصد ہی عبادت ہے۔فرمان الٰہی ہے{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ}[الذاریات: 56] میں نے جنوں اور انسانوں کوصرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔

اگر ایک مسلمان قضائے حاجت کرتا ہے، یہ بظاہر تو اس کی طبعی وفطری ضرورت ہے مگر اس کو بھی اگر وہ شرعی آداب ملحوظ رکھتے ہوئے بجا لائے گا تو اسے اجر ملے گا۔ جیسے بیت الخلا میں داخلے سے قبل اور نکلتے وقت دعا پڑھنا، بایاں پاؤں پہلے داخل کرنا۔ استنجا کے شرعی آداب کا لحاظ کرنا۔حتی کہ انسان اپنی جو جنسی اور شھوانی ضرورت اپنی اہلیہ سے پوری کرتا اس میں بھی اجر رکھا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''في بضع احدكم صدقة ''[1] حتی کہ جائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کرنا بھی صدقہ ہے۔ ماں باپ، بچوں کا پیٹ پالنا، رزق تلاش کرنا یہ دنیاوی تقاضے ہونے کے ساتھ شرعی تقاضا بھی ہے۔ اگر شریعت کو نکال دیں تو کوئی یہ کہہ سکتا ہے میں اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پالتا اپنے بوڑھے ماں باپ کا خیال نہیں رکھتا، اپنی اولاد کی تربیت کا لحاظ نہیں رکھتا! تو اسے کون پابند کرے گا؟ اگر کہیں گے کہ ملکی قانون تو ہم کہتے ہیں احکم الحاکمین کے قانون کو نہیں مانتے اور دنیا کے بنائے قوانین کا خود کو پابند کرتے ہو!۔ {تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَى}[النجم:22] یہ تو بڑی ناانصافی کی تقسیم ہے۔

الغرض اسلام میں دین سے ہٹ کر کوئی دنیا نہیں ، اگر ہے تو وہ دین کے ماتحت ہے، اسلام بندے کو اپنی ماں سے محبت کرنا، اپنے باپ کا خیال رکھنا سکھاتا ہے۔جس معاشرے نے دنیا کو دین سے الگ کرلیا ہے اس کی جا کر حالت دیکھ لو کہ کیسے بوڑھے ماں باپ اولڈ ہاؤسز میں سسکیاں لیکر مرتے ہیں۔

انسان مرجاتا ہے تو اسلام اس کی اولاد کی کفالت کا بندوبست کرتا ہے اس کی متروکہ دولت کو مستحقین میں عادلانہ طرز پر تقسیم کرتا ہے جسے علم میراث کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دین اور دنیا میں تفریق اسلامی نظریہ نہیں بلکہ جیسا ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ سیکولر انقلاب کا نتیجہ ہے، جس نے آج پورے یورپ کو بالخصوص اور پوری دنیا کو بالعموم مادر پدر آزاد کر دیا ہے۔

---

[1] صحیح ابن حبان، مسند احمد

۳: مادہ پرستی:

اس وقت تمام مسلمان ملکوں میں بلا استثناء سرمایہ درانہ نظام کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یہ نظام محض عوام تک محدود نہیں رہا دینی اداروں میں بھی اپنی مکمل شان وشوکت سے موجود ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "لکل امة فتنة و فتنة امتی المال "[1] ہر امت کیلئے آزمائش اور فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔اس وقت ہم ایسے دور سے گذر رہے ہیں جو مال کا دور ہے۔ ایک طوائف بھی معاشرے میں اس وقت شریف شمار ہونے لگتی ہے جب اس کا بینک بیلنس شرافت کے حدود میں داخل ہوجائے۔ مزید یہ کہ مال کمانے والے ذرائع پر ایسے لوگوں کی اجارہ داری ہے جو دین، سماج، اخلاق کی دھجیاں اڑانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی لیے شیخ سعدی نے کہا تھا:

اے زر! تو خدا نیش ولیک کم تر از خدا نیشی

اے پیسے تو خدا تو نہیں لیکن تو خدا سے کم بھی نہیں۔ چنانچہ جب ساری ضرورت مال پوری کرتا ہے تو اللہ، دین اور علماء کی ضرورت کہاں باقی رہ گئی۔ ظاہر ہے پھر علماء سے لوگ دور ہوں گے۔ اب یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ "سب کچھ مال ہے" کے فتنے کو مٹا کر "سب کچھ دین ہے" جیسے نعرے کو مقبول عام بنا دیں۔[2]

ہماری قوم میں دین و دنیا کے تصور کو یہاں ایک معمولی سے مثال سے یہ سمجھیں کہ عوام الناس میں دینی فکر اور سوچ رکھنے والے لوگ بھی دین کو پیسے سے خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر بچے کو دنیاوی اچھی تعلیم دلانی ہے تو شدید سردی میں بھی بچے کو دور دراز معیاری اسکول میں چھوڑ کر آئیں گے۔ باپ مصروف ہے تو وہ اپنے بچے کیلئے ڈرائیور رکھے گا، ٹرانسپورٹ کا انتظام کرے گا۔ لیکن جب دینی تعلیم اور قرآن سیکھنے کی باری آئے گی تو کہیں گے مدرسے یا مسجد جانے کی ضرورت کیا ہے؟ گھر میں قاری صاحب کو چند پیسے دیکر بلا لیں گے!۔ لیکن یہ ناداں یہ نہیں سمجھتے کہ شرعی علم کے حصول کیلئے آپ کے بچے کے مدرسے یا مسجد کی طرف اٹھنے والے ایک ایک قدم پر نیکی لکھی جاتی ہے۔ اسے مسجد بھیجنے سے بچے کا دل مسجد سے جڑے گا اور جس کا مسجد سے دل جڑ گیا اس کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت اسے اپنے عرش کا خصوصی سایہ مہیا کرے گا جس دن اس کے عرش کے سوا کہیں سایہ نہ ہوگا ان میں ایک شخص وہ

---

[1] سنن الترمذی، صحیح ابن حبان [2] www.thefreelancer.co.in

بھی ہے کہ ''رجل قلبه معلق بالمساجد'' جس کا دل مسجد سے جڑا رہے۔ بچے کو مسجد اور مدرسے بھیجنے کی بڑی حکمتیں ہیں۔ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ھارون الرشید نے امام دار الھجرہ امام مالک رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ وہ ان کے محل میں آکر ان کے بچوں کو حدیث کی کتاب ''مؤطا'' پڑھائیں آپ نے فرمایا اے امیرالمؤمنین ''العلم یؤتی ولا یأتی''علم کے پاس جانا پڑتا ہے وہ کسی کے پاس نہیں آتا'' ھارون نے یہ بات سنی تو کہنے لگے آپ نے سچ فرمایا۔ پھر ھارون الرشید نے اپنے بچوں سے کہا کہ چلو مسجد میں جاکر لوگوں کے ساتھ درس حدیث سنو۔

اس سے طبقاتی تفریق ختم ہوگی۔ بچہ غریب بچوں کے ساتھ بیٹھے گا اس سے اس میں غریبوں سے ہمدردی ہوگی، امیر غریب میں خلیج کم ہوگی۔غریبوں سے خیر خواہی کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوگا۔ بصورت دیگر قاری صاحب چند ٹکے لیکر گھر میں تو بچوں کو پڑھا جائیں گے۔لیکن وہ قرآن بچے کے دل میں گھر نہیں کرے گا وہ قرآن کو اپنی ضرورت نہیں سمجھے گا بلکہ یہ سمجھے گا کہ میں قرآن کی ضرورت ہوں۔ پھر اسکول کی پڑھائی کی وجہ سے والدین اپنی تمام تر تفریحی اور زیارت کے پروگراموں کا شیڈول بچے کے اسکول کے شیڈول کو دیکھتے ہوئے اس کی چھٹیوں سے منسلک کریں گےلیکن قرآنی تعلیم میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔کہیں رشتہ داروں کے پاس جانا ہے یا تفریح کیلئے تو قاری صاحب کو منع کردیں گے کہ آج آپ مت آیئے گا۔مگر دنیاوی اسکول سے ایسا برتاؤ نہیں کریں گے الغرض جب ہم مسلمان اپنے دین سے سوتیلے پن کا سلوک کرتے ہیں تو پھر کہاں مسلمانوں کو عزت ملے گی کہاں سے ہمارے معاشرے ترقی کریں گے۔

اہل صنم اوج ثریا سے جا ملے اور اہل حرم دعاؤں کا اثر دیکھتے رہے

۴:علماء کے حقوق سے ناواقفیت:

ہمارے دین میں علماء کا ایک عظیم مقام ومرتبہ اور حیثیت ہے جس طرح سے ان کا فریضہ،شریعت کو بلا کم وکاست پہنچا دینا ہے اسی طرح امت کی بھی ذمہ داری ہے کہ ان کی تعظیم اور ادب بجالانے میں کوئی کوتاہی نہ کرے اور ایک مقتدی اور رہنما کی جیسی قدر بجالانی چاہئے۔لیکن افسوس کہ ملت اسلامیہ کا ایک طبقہ اپنی تعظیم میں غلو کرواتا ہے اور دوسرا طبقہ حقیقی تعظیم بھی فراموش کروادیتا ہے جو علماء سے دوری کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

۵۔تربیت کی کمی:

اساتذہ اور مشائخ کی تعظیم وتکریم کی اعلیٰ مثالوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے کہ کیسے کیسے ہمارے اسلاف نے اپنے مشائخ وعلماء کی تعظیم وتکریم کی۔مگر صد افسوس کہ اس دور میں عوام کی اس نہج پر تربیت نہ تو علماء نے کی ہے نہ گھروں میں بچوں کو یہ تربیت دی جاتی ہے نہ تعلیمی اداروں میں۔جبکہ ہونا یہ چاہئے کہ اسلاف کے واقعات عوام کو بتلا کر نیز خود اپنے مشائخ اور اساتذہ کی واقعی تعظیم کر کے ہم اپنے عوام کو تربیت دیتے تو یہ عوام ہماری بھی تعظیم کرتی لیکن ہم نے اپنے لوگوں کی ایسی تربیت ہی نہیں کی کہ وہ علماء کی تعظیم کریں۔

۶۔مغربی افکار سے اثر پذیری:

آج مغرب میں ایک استاد کا تصور کیا ہے؟صرف کلاس روم میں کتابیں پڑھانے والا۔اس روم سے باہر اپنے شاگردوں پر اس کا کوئی اثر نہیں۔چرچ کا پادری کس لیے ہے؟ صرف اتوار کو دعائیہ محفل منعقد کرنے کے لیے وغیرہ وغیرہ

بعینہ اسی طرح جمعہ،عیدین، جنازہ،قربانی،نکاح،طلاق کو چھوڑ کر مسلم معاشرے کو بھی علماء کی چنداں ضرورت نہیں اور جب نوبت یہاں تک پہنچی ہو تو دوری تو آنی ہی تھی پھر اس پر تعجب کس لیے۔

اسباب اور بھی ہیں جن کا احصاء یہاں ممکن نہیں۔ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم مذکورہ اسباب کو سمجھیں اور اس کا سد باب کریں تا کہ علماء اور عوام میں قائم خلیج کو ختم کیا جا سکے اور اپنے معاشرے میں علماء کا کھویا ہوا وقار بحال کیا جا سکے۔

علماء اور عوام کے مابین دوری کیلئے استعمار نے جو ہتھیار استعمال کئے ان میں علماء اور مدارس پر بنیاد پرستی، دہشت گردی اور انتہاء پسندی کا الزام لگایا اور ہماری عوام اور میڈیا نے اس رائے کو تقویت دی۔اب جو بھی مولوی یا مدرسے کا نام سنتا ہے ذہن دہشت گردی کی طرف چلا جاتا ہے۔

{يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ} [التوبة:32]

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ انکاری ہے مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے گو کافر ناخوش رہیں۔

ان حالات میں امت کا فریضہ ہے کہ وہ مدارس کے نظام کو تقویت پہنچائیں،علماء سے ان کا ارتباط گہرا

ہو، دینی اداروں کو ان کا تعاون اور اعتماد حاصل رہے۔ بدقسمتی سے بعض حضرات اپنی ناسمجھی اور نادانی کی وجہ سے ایسی باتیں کہہ جاتے اور لکھ جاتے ہیں جن سے مدارس اور اہلِ مدارس کی بے وزنی ہوتی ہے۔ بعض اخبارات ورسائل وجرائد میں اہل علم کا تمسخراور دینی اداروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

اس طرح کی باتیں کہہ اور لکھ کر دراصل ہم اپنے دشمنوں کو طاقت پہنچاتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ وہ مادیت کے پرستار نہیں ہیں، وہ الہ واحد کے پرستار ہیں، ان کے لیے دنیا سے بڑھ کر دین ہے، ان کی منزل اس جہانِ فانی سے آگے ہے، اور ان کے دین کا تحفظ علماء سے ارتباط اور مدارس کی بقاء میں ہے۔ علماء اور مدارس کی مثال سرحد پر متعین ان فوجیوں کی ہے جو دشمن سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کو کمزور کرنا اپنے آپ کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔

علمی طبقے سے منسوب کچھ لوگ بھی اس فیلڈ کو بدنام کرنے پر لگے ہوئے ہیں، جو اپنے مفادات کے حصول کیلئے علم اور علماء کو بدنام کرتے ہیں مولویانہ حسد ایسی جڑیں مضبوط کر چکا ہے کہ دوسرے کی بےعزتی کر کے اپنی عزت بنانے کو مشغلہ بنالیا گیا ہے۔ اپنے بڑوں کی، معاصرین کی نجی اور پرسنل قسم کی غلطیوں کو بھی قطعی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ عوام میں اپنے ہم عصر اہل علم وطلباء پر تنقید کر کے جگ ہنسائی کا سماں پیدا کرتے ہیں۔

ابوحازم کہتے ہیں کہ ”اگلے زمانے میں علماء کی حالت یہ تھی کہ عالم اپنے سے بڑے عالم کو دیکھتا تو نہایت خوش ہوتا، برابر والے سے ملتا تو علمی مذاکرہ کرتا، ادنی سے سامنا ہوتا تو گھمنڈ سے کام نہ کرتا لیکن ہمارے اس زمانے کی حالت یہ ہے کہ عالم اپنے سے بڑے عالم میں خامیاں نکالتا ہے تاکہ لوگ متنفر ہو کر اسے چھوڑ دیں، برابر والے سے مذاکرہ نہیں کرتا اور ادنی کو پاتے ہی اکڑنے لگتا ہے“۔[1]

ہمارے معزز علماء خواہ وہ جامعات کے نظماء ہوں یا تنظیموں کے رہنما کبھی یہ فکر نہیں کرتے کہ اپنے علماء سے باعزت انداز سے کام لیں تاکہ سماج میں ان کا وقار محفوظ ہو، نہ تو یہی فکر رکھتے ہیں کہ کسی طرح ان کے مسائل حل ہوں بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے مسائل حل نہ ہوں تاکہ وہ علی حالہ سڑک پر موجود رہیں۔

الامن رحم اللہ

بعض دفعہ بعض جگہوں پر علماء سے کچھ ایسے کام بھی لیے جاتے ہیں جو سماجی حیثیت سے پست ہوتے

[1] جامع بیان العلم وفضلہ

ہیں، اپنی اصل کے اعتبار سے جواز کے حدود میں کوئی بھی کام پست نہیں ہوتا ایک ہی کام کہیں پست ہوتا اور کہیں پست نہیں ہوتا، یہ سماجی رویے پر منحصر ہے اس لیے سماجی نفسیات کا لحاظ ضروری ہے علماء کرام نے "خوارم المرؤۃ" کی شرط یوں ہی نہیں لگائی ہے۔

ہم عصر زبان سے عدم واقفیت نے ایک بڑے طبقے کے نزدیک اہل علم کو بے وزن کر دیا ہے۔

فقہی کنفیوژن سے بھی عوام میں اضطرابی کیفیت جنم لیتی ہے۔ یہ تو بڑی خوبی کی بات ہے کہ علماء اہل حدیث قرآن وسنت کی روشنی میں بے لاگ طور پر مسائل بیان کرتے ہیں اور علم نہ ہونے پر سیدھی سی خاموشی اختیار کرتے ہیں مگر بعض بے اعتدالیاں ہیں جن سے ماحول مکدر ہو جاتا ہے حتی کہ تھوڑی سی سوجھ بوجھ رکھنے والی عوام بھی فتوے دے مارتی ہے۔ گویا

یہ جوئے شیر تو ہم بھی نکال سکتے ہیں
مزہ تو جب ہے کہ فرہاد شعر کہنے لگے

ادھر عوام الناس پر ضروری ہے کہ وہ ذمہ داریوں کو سمجھیں۔ اور علوم ضرور یہ حاصل کریں تاکہ ایک باپ اور ایک ماں شرعی طور پر اتنا جانتی ہو کہ اس نے اپنی اولاد کی تربیت کس نہج پر کرنی ہے اسی باعث ہمارے گھر اور معاشرہ فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ قرون اولیٰ کے فتنے اپنی قوت اور شوکت کے باوجود پسپائی اس وجہ سے اختیار کر گئے کہ اس وقت عوام کا علماء سے تعلق مضبوط تھا، جیسے کوئی فتنہ سر اٹھاتا اہل علم لوگوں کا ہاتھ تھام لیتے اور انہیں فتنے سے نکال لیتے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الفتن إذا أقبلت عرفها كل العالم وإذا أدبرت عرفها كل الجاهل"

فتنہ جب سر اٹھاتا ہے تو ہر عالم اسے پہچان لیتا ہے اور جب تباہی مچا کر چلا جاتا ہے تو پھر جاہل کو پتہ چلتا ہے کہ یہ فتنہ تھا۔

میمون بن مہران رحمہ اللہ فرماتے ہیں: : "بنفسي العلماء هم ضالتي في كل بلدة وهم بغيتي إذا لم أجدهم، وجدت صلاح قلبي في مجالسة العلماء"۔ [1]

میں علماء پر اپنی جان نچھاور کرتا ہوں ہر شہر میں وہ میرے گمشدہ زیور ہیں، اگر مجھے نہ ملیں تو وہی میرا

[1] جامع بیان العلم وفضلہ ج1 ص211

مقصد ہیں، میں نے اپنے دل کی اصلاح علماء کی مجلس میں بیٹھ کر کی ہے۔

اسباب کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

یہ جاننے کے بعد کہ اہل علم اور عوام میں خلیج کا باعث اور سبب دونوں جانب موجود ہے اور اس کا حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان اسباب کا تدارک نہ کیا جائے اور اسباب کا تدارک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فریقین کو ایک دوسرے کے حقوق معلوم نہ ہوں۔ ذیل میں ہم بعون اللہ وتوفیقہ اہل علم کے عوام پر اور عوام کے اہل علم پر چند حقوق کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اہل علم کے عوام پر حقوق

علماء کرام کے عوام الناس پر بے شمار حقوق بروئے شریعت لازم ہوتے ہیں جن میں چند حقوق وہ ہیں جن میں تمام مسلمان شامل ہیں اور اہل علم بدرجہ اولیٰ اس میں آئیں گے کیونکہ فرمان باری جل وعلا ہے

{ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ } [فاطر: 28]

اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

ان حقوق میں سے ان پر سلام کرنا، ان کی غیبت سے خود کو بچانا، ان کی دعوت کو قبول کرنا، چھینک کا جواب دینا، بیمار پرسی کرنا، وفات پر جنازہ میں شرکت کرنا وغیرہ

اور چند حقوق ایسے ہیں جو اہل علم کیلئے خاص ہیں جن میں بھلائی کے کاموں میں ان کی اطاعت کرنا، ان کی باتوں کے خلاف چلنے سے گریز کرنا، اور اگر ان سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو اس باب میں انہیں معذور سمجھنا،

سیدنا امیر المؤمنین جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ عالم کے حقوق سے متعلق فرماتے ہیں:

''آپ پر عالم کے حقوق میں سے یہ حق ہے کہ لوگوں پر عمومی سلام کرو اور عالم دین پر خصوصی طور پر سلام پیش کرو، اس کے سامنے ادب سے بیٹھو، اس کی مجلس میں ہاتھوں اور آنکھوں سے اشارے مت کرو، اس کے سامنے یہ مت کہو کہ فلاں یہ کہتا فلاں یہ کہتا ہے۔ تا کہ اس کی مخالفت نہ ہو، اس کے پاس کسی کی غیبت مت کرو، اس کی مجلس میں سرگوشیاں مت کرو، اس کے کپڑے کو پکڑ کر مخاطب نہ کرو (جیسا کہ دوست ایک دوسرے سے کرتے ہیں)۔ اگر عالم سستی یا تھکان کے باعث کچھ وقت کیلئے آپ کو کوئی چیز نہ سکھائے تو اس کے سامنے سیکھنے کیلئے اصرار مت کرو، اس کی صحبت سے مت اکتاؤ کیونکہ اس کی مثال کھجور کی ہے کچھ

پتہ نہیں کہ کس وقت کوئی کھجور آپ پر گر پڑے۔ایک عالم دین مومن روزہ دار اور غازی سے بڑھ کر اجر پانے والا ہے۔ایک عالم دین کے فوت ہونے سے اسلام میں ایسا زخم لگتا ہے جو تا قیامت مندمل نہ ہوگا''۔[1]

لہٰذا اہل علم کی تحقیر سے بچنا، انہیں رسوا و ذلیل کرنے سے بچنا، غیور اہل علم کی اطاعت کرنا ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اہل علم سے متعلق فرماتے ہیں:

''علماء کرام دنیا میں ستاروں کی مانند ہیں اندھیروں میں بھٹکا ہوا ان کے ذریعہ راستہ تلاش کرتا ہے، اور لوگوں کو علماء کی ضرورت کھانے پینے کی ضرورت سے بڑھ کر ہے، اور از روائے قرآن علماء کی اطاعت ان پر ماں باپ سے بھی بڑھ کر فرض ہے فرمان باری تعالیٰ ہے: اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو (رسول اللہ علیہ وسلم) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی''

اور سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور تابعین میں حسن بصری ابو العالیہ اور عطاء بن ابی رباح ضحاک اور مجاہد رحمہم اللہ (ایک روایت میں) فرماتے ہیں "أولو الأمر" سے مراد علماء کرام ہیں۔امام احمد سے بھی ایک روایت میں یہی مروی ہے۔اور ابو ھریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما (ایک روایت میں) اور زید بن اسلم اور سدی اور مقاتل فرماتے ہیں:" ھم الأمراء" اس سے مراد امراء ہیں اور امام احمد سے ایک روایت میں یہی منقول ہے۔

درحقیقت امراء کی اطاعت اس وقت ہوگی جب وہ علم کے تقاضوں کے مطابق حکم دیں تو ان کی اطاعت علماء کی اطاعت کے تابع ہے، تو اطاعت معروف میں ہوگی جو بروئے علم واجب ہوتی ہے۔تو جیسا کہ علماء کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے اسی طرح امراء کی اطاعت علماء کی اطاعت کے تابع ہے، اور اسلام کا قیام دونوں فریقوں یعنی علماء اور امراء کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے، اور تمام لوگ ان دونوں گروہوں کے تابع ہیں لہٰذا عالم انسانی کی اصلاح ان دونوں طبقوں کی اصلاح پر مبنی ہے اور اس کی تباہی اور فساد ان دونوں گروہوں کے فساد و تباہی پر مبنی ہے۔[2]

علماء کرام کے خصوصی حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ: شرعی مسائل میں ان سے راہنمائی لی جائے اور پیچیدہ مسائل میں ان سے رجوع کریں۔

---

[1] الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي رحمه الله ج1 ص199

[2] إعلام الموقعين عن رب اللعالمين. لإبن قيم الجوزية. ج1 ص10

فرمان باری تعالیٰ ہے:

{فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ} [النحل: 43]

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔ نیز فرمایا:

{وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا} [النساء: 83]

” اگر یہ لوگ اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور اپنے میں سے ایسی باتوں کی تہہ تک پہنچنے والوں کے حوالے کردیتے تو اس کی حقیقت وہ لوگ معلوم کرلیتے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو معدودے چند کے علاوہ تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔“

ان کی پیروی اور اقتدا کی جائے اور ان کا توقیر واحترام بجالایا جائے۔

علماء کرام کی عزت، احترام توقیر وتقدیر کا شرعاً حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے، ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے۔ اور ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے۔“[1]

اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ سفید ریش بوڑھے مسلمان اور حامل قرآن کا اکرام کیا جائے، ہاں اس میں غلو اور جفوت نہیں ہونی چاہیے، اور عدل کرنے والے سلطان کا اکرام کیا جائے۔“[2]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

ما الفضل إلا لأهل العلم إنهم — على الهدى لمن استهدى أدلاء

فضیلت تو صرف اہل علم کو حاصل ہے وہ خود بھی ہدایت یافتہ ہیں اور جو ہدایت کا متلاشی ہے اس کے بھی راہنما ہیں

اہل علم کیلئے دعا کرنا اور ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے استغفار طلب کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"وإن العالم ليستغفرُ له مَنْ في السموات ومن في الأرض حتى الحيتانُ في الماء"۔

عالم کیلئے جو بھی زمین وآسمان میں مخلوق ہے وہ مغفرت طلب کرتے ہیں یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں بھی۔

---

[1] حاکم [2] ابو داؤد

ایک مقام پر آپ نے فرمایا:

"من صنع إليكم معروفا فكافئوه فإن لم تجدوا ما تكافئونه به، فادعوا له حتى تروا أنكم قد كافأتموه". [1]

جو آپ سے کوئی خیر خواہی اور نیکی کرے اسے بدلہ دیا کرو، اگر تمہارے پاس بدلے کیلئے کچھ نہ ہو تو اس نیکی کرنے والے کیلئے اتنی دعا کرو حتی کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ تم نے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے۔

تو علماء کرام جو لوگوں کے ساتھ نیکیاں اور خیر خواہی کرتے ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔

اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو انہیں معذور سمجھا جائے:

علماء معصوم نہیں ہیں پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر بنی آدم خطا کار ہے اور سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جو غلطی کر کے توبہ کرے''۔

عوام کے علماء پر حقوق

جس طرح علماء کے عوام پر حقوق ہیں اسی طرح عوام کے بھی کچھ حقوق ہیں جو اہل علم پر لازم ہوتے ہیں۔ جنہیں نکات کی صورت میں ذکر کیا جاتا ہے۔

❶ لوگوں میں علم کی نشر و اشاعت کرنا۔ ❷ ہر محاذ پر چاہے وہ سماجی ہو یا سیاسی، مذہبی ہو یا دنیاوی پر امت کی قیادت کریں۔ ❸ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ ❹ بلا کسی خوف وخطر اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دیں۔ ❺ اہل باطل وشرک وبدعت کے باطل نظریات کی تردید کریں۔

❻ امت کی خیر خواہی کریں۔ انہیں اچھے مشورے دیں۔

یہ چند اہم حقوق تھے اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی سربلندی کیلئے کوشاں رہنے اور اللہ تعالیٰ کے دین اور اس سے منسوبین کی توقیر واحترام کی توفیق عطا فرمائے۔ اس امت کا دور عظمت اس وقت ہی لوٹے گا جب عوام اور علماء دونوں مل کر کاوشیں کریں گے۔ ورنہ وہی ہوگا جیسا کہ قرآن نے بیان فرمایا:

{وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ} [الأنفال: 46]

اور اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو، آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر وسہار رکھو یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

---

[1] رواه أبو دواد.

عقیدہ ومنہج

شامی صدر بشار الاسد کے مذہبی فرقہ
شیعہ نصیریہ
سے متعلق چند اہم معلومات

عبدالمجید محمد حسین بلتستانی [1]

یہ نُصیری جو کہ عوام میں اپنے آپ کو علوی کہلوانا پسند کرتے ہیں، اپنے آپ کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی نسبت ابو صہیب محمد سے ہے جو کہ ابن نُصیر (ن کے پیش اور ص کے زبر کے ساتھ نُصَیر) کہلاتا ہے۔ اس شخص کا دعویٰ تھا کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے کے آخری تین اماموں (شیعہ روایت کے مطابق) کی صحبت سے فیض یاب ہوا ہے جن میں گیارہویں امام حسن عسکری بھی شامل ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سچائی کا دروازہ قرار دیا۔

یہ فرقہ ابن نُصیر کے ایک پیروکار عبداللہ الاکشبی نے منظم کیا جس کی موت 969ء میں حلب شہر میں ہوئی۔ اس کا پوتا اور شاگرد الطبر انی 1032ء میں لاتیکا میں منتقل ہوا جو کہ شام کی ساحلی پہاڑی پٹی ہے۔ اس وقت یہ علاقہ قسطنطینی سلطنت کے زیر اہتمام تھا۔ اس نے اور اس کے شاگردوں نے شام کی ساحلی پٹی کے رہنے والوں کو علوی یا نُصیری عقائد کی تبلیغ کی۔ یہ عقائد کیا تھے؟ ان کی مختصر تفصیل یہاں بیان کی جاتی ہیں جو یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

یارون فریڈ مین (Yaron Friedman) اور مالسی روتھ وین (Malise Ruthven) مشہور صحافی اور مشرق وسطیٰ کے معاملات کے ماہر (BBC کی عربی سروس کا اسکرپٹ رائٹر) ان کے عقائد کو کچھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] متعلم مدینہ یونیورسٹی، شعبہ اصول الدین

تقیہ:

نُصیری اپنے بنیادی عقائد کو چھپائے رکھتے ہیں۔تقیہ ان کے عقیدے کا بنیادی جزو ہے۔
اسلام کے پانچ بنیادی ارکان ہیں لیکن نُصیریوں کے عقائد کے مطابق کلمہ،عمل، نماز، حج اور رمضان کے روزے اسلام کی ظاہری علامتیں ہیں جن پر عمل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔نُصیریوں کے دین کے دو بنیادی اصول ہیں۔

1 سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عبادت: (نعوذ باللہ) ولایت:

ان کے مطابق اللہ سات زمانوں میں سات صورتوں میں ظاہر ہوا اس کا پہلا ظہور سیدنا آدم علیہ السلام کی صورت میں تھا اور آخری سیدنا محمد ﷺ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی صورت میں۔
اس طرح یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے بھی قائل ہیں۔اس بناء پر یہ ان بقیہ رافضیوں سے زیادہ غلو کرتے ہیں جو صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پہلے اور سچے خلیفہ ہونے پر مصر ہیں۔

2 عقیدہ تثلیث:

ان کے مطابق محمد ﷺ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ الوہیت کے تین روپ ہیں جو ایک ہی وقت میں جلوہ گر ہوئے۔ستارہ شناسی کو ان کے ہاں خاص مرتبہ حاصل ہے اس لیے وہ یقین رکھتے ہیں کہ تمام انسان آسمان کے ستارے تھے جو کہ اپنے گناہوں کی وجہ سے آسمان سے گر گئے اور وہ سات جنموں کے بعد دوبارہ ستاروں پر لوٹ جائیں گے جہاں کے بادشاہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جو ان کا انکار کرتا ہے وہ ایک جانور بن کر پیدا ہوگا۔عورتیں بہرحال ستارے ہونے سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ شیطانوں کے گناہوں کی پیداوار ہیں۔اب تو کچھ نُصیری یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ عورتوں میں روح سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔اس کے علاوہ یہ کرسمس منانے کے بھی قائل ہیں۔ان کے عقائد کی تفصیل بہت وسیع ہے جن کو پوری طرح بیان کرنے کا یہ مقام نہیں ہے۔
ان کے بارے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے یہ الفاظ ہی کافی ہیں، آپ فرماتے ہیں:
”یہ لوگ جو اپنے آپ کو نُصیری نام سے منسوب کرتے ہیں اور وہ گروہ جو کہ قرامطہ اور باطنیہ ہیں

عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی بڑے کافر ہیں۔ نہ صرف اُن سے بلکہ یہ مشرکین سے بھی بڑے کافر ہیں اور امت محمد یہ کو ان سے پہنچنے والا نقصان اس گروہ کے نقصان سے بڑا ہے جو کہ مسلمانوں سے لڑتے ہیں جیسا کہ تاتاری، فرنگی کافر وغیرہ"

شاید انہی عقائد کے سبب دوسرے رافضی فرقے بھی انہیں 1974ء تک مسلمان نہ مانتے تھے، بلکہ اہل سنت والجماعت کی طرح انہیں غالی کہتے تھے۔ نُصیری فرقہ جو کہ عثمانی خلافت کے زمانے تک مسلمانوں کے رعب کی وجہ سے دبکا رہا۔ سقوط خلافت کے ساتھ ہی اپنے پر نکالنے شروع کر دے۔

1936ء میں جب فرانسیسی حکمرانوں نے نُصیری ریاست اور شام کے دوبارہ الحاق کا ارادہ کیا تو نُصیری قبیلوں کے سرداروں نے فرانس میں قائم شدہ پاپولر فرنٹ کے سربراہ کو ایک میمورنڈم بھیجا، جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1. علوی لوگ جنھوں نے کئی سالوں تک بڑی غیرت اور قربانیوں کے ساتھ اپنی آزادی کی حفاظت کی ہے، دوسرے سنی مسلمانوں سے مختلف ہیں۔

2. علوی، مسلم شام کے ساتھ اپنے الحاق کا انکار کرتے ہیں کیونکہ شام کا سرکاری دین اسلام ہے اور اسلام کے مطابق علوی کافر ہیں۔

3. ہم اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ دمشق کے مسلمانوں نے اپنے درمیان رہنے والے یہودیوں کو ایک دستاویز پر دستخط پر مجبور کیا کہ وہ فلسطین میں رہنے والے اپنے بدقسمت یہودی بھائیوں کو مدد نہیں بھیجیں گے۔ یہودیوں کی فلسطین میں قابل رحم حالت اسلام میں موجود اس زیادتی کی واضح مثال ہے جو کہ وہ غیر مسلموں سے روا رکھتا ہے۔ حالانکہ ان اچھے یہودیوں نے عربوں کے اندر تمدن اور امن کی آبیاری کی، سونا بانٹا اور بغیر کسی کا مال لُوٹے اور نقصان پہنچائے فلسطین میں خوشحالی لے آئے، پھر بھی مسلمانوں نے ان کے ساتھ اعلان جنگ کیا اور سرکارِ برطانیہ کی فلسطین میں موجودگی اور فرانس کی شام میں موجودگی کے باوجود ان کا قتل عام کرنے سے کبھی نہ ہچکچائے،! چنانچہ رائے عامہ کا احترام نہ کرتے ہوئے اگر مسلم شام کو مسلم فلسطین کے ساتھ اکٹھا کر دیا گیا تو یہ ان یہودیوں اور دوسری اقلیتوں کا بدترین انجام ہوگا۔

ایک اور خط میں رقم طراز ہیں:

کیا فرانسیسی اس بات سے بے خبر ہیں کہ صلیبی جنگیں کامیاب ہو جاتیں اگر ان کے قلعے شام کے شمال مشرق میں نُصیری سرزمین پر ہوتے۔

ہم نے اس تفصیل کو اس لئے اکٹھا کیا ہے تاکہ موجودہ فساد کی تھوڑی سی تاریخ بھی قارئین تک پہنچائی جا سکے۔ مندرجہ بالا میمورنڈم میں نصیریہ اسلام دشمنی اور یہود سے دوستی ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے۔ اس میمورنڈم پر دستخط کرنے والوں میں سے ایک نام ''سلمان الاسد'' کا ہے جو کہ ''کلبیہ'' قبیلے کا سردار تھا۔

یہی ''سلمان'' موجودہ صدر بشار الاسد کا دادا اور حافظ الاسد کا باپ ہے۔

شام کے فرانسیسی حکمرانوں نے جن کو اصل خطرہ سنی اسلام سے تھا ان علویوں کی ایک علیحدہ فوج تشکیل دی اور انہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ یہی فوج فرانسیسی سامراج سے آزادی کے بعد شامی نیشنل آرمی کہلائی۔ 1946ء میں ایک علوی خاندان کے ہونہار فرزند نے صرف 16 سال کی عمر میں بعث پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ خود حافظ الاسد ہی تھا جس نے سیاست میں شمولیت کے ساتھ ساتھ نیشنل آرمی بھی جوائن کر لی تھی۔

بعث پارٹی جس کا منشور ''وحدت، حریت، اشتراکیت'' تھا اور جو عرب نیشنلزم کی علمبردار تھی، اس نے جب 1958ء میں ناصر کی تعلیمات سے متاثر ہو کر شام کا مصر کے ساتھ الحاق کرنے کا ارادہ کیا تو بعث پارٹی میں موجود علویوں نے اسے بھی اپنے سر پر بجنے والی خطرے کی گھنٹی سمجھا۔ انہیں عرب نیشنلزم میں بھی یہ خطرہ نظر آیا کہ اس میں سنیوں کی اکثریت ہو گی چنانچہ 1963ء میں ایک علوی ''صالح حدید'' کی قیادت میں انہوں نے بغاوت کر دی۔ حافظ الاسد جو کہ ایک فائٹر پائلٹ تھا کو ایک ایئر فورس کمانڈر بنا دیا گیا۔ فوج کے تقریباً سات سو عہدوں پر پرانے افسروں کو نکال کر نئے نُصیری کمانڈر تعینات کیے گئے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شام کی شکست کے بعد حافظ الاسد جو کہ اب وزیر دفاع بن چکا تھا نے شامی حکومت پر اسرائیل کے ساتھ خفیہ مراسم رکھنے کا الزام لگایا اور ایک محلاتی سازش کے تحت 1970ء میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح اقتدار پر علویوں کی پکڑ مضبوط ہو گئی۔

اس پکڑ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1982ء میں جس سینتالیسویں شامی ٹینک بریگیڈ نے حمص میں تقریباً بیس سے تیس ہزار اخوانیوں کو شہید کیا تھا اس کے 70 فیصد سے زیادہ آفیسرز علوی تھے اور

اس آپریشن کی قیادت حافظ الاسد کے سگے بھائی رفعت الاسد نے کی تھی۔ یہ آپریشن آج بھی جدید مشرق وسطیٰ میں اپنی ہی عوام پر فوج کشی کی بدترین مثال ہے۔

علویوں کا اقتدار میں آجانا شامیوں کے لئے کسی سانحے سے کم نہ تھا۔ایک کافر بھلا مسلم اسٹیٹ کا سربراہ کیسے ہوسکتا ہے؟

مغربی مورخ ڈینئل پائپز(Daniel Pipes)اپنی تصنیف(Great Syria)میں لکھتا ہے کہ

''شام میں کسی علوی کا برسر اقتدار آنا ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان میں کسی شودر یا روس میں کسی یہودی کو زار بنا دیا جائے''۔(واضح رہے کہ ان دونوں ممالک میں مذہبی تفاوت کی وجہ سے ایسا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔)

اسی وجہ سے حافظ الاسد کے صدر بنتے ہی شامی قانون میں ایک تبدیلی کی گئی۔ وہ قانون جو کہ شام کا صدر بننے کے لیے سنی مسلمان ہونا ضروری قرار دیتا تھا اس کی شق کو بدل کر حکمران کا صرف مسلمان ہونا کافی قرار دیا گیا۔

رافضی فتنہ جو بڑے عرصہ سے عرب دنیا میں اپنا پنجہ گاڑنے کے لئے تیار بیٹھا تھا بھلا اس موقع کو ضائع کیسے جانے دیتا۔ چنانچہ لبنان کے اثناعشری رافضی امام موسی الصدر نے 1973ء میں ایک فتویٰ جاری کیا جس کے مطابق نُصیریوں کو باقاعدہ شیعہ فرقے کا ایک گروپ تسلیم کرلیا گیا۔ یہ فتویٰ مذہبی سے زیادہ سیاسی تھا جس کے پیچھے عرب عالم میں رافضی اقتدار کو فروغ دینا تھا۔(یاد رہے کہ یہ موسی الصدر جو کہ امام موسیٰ کے نام سے بھی مشہور ہے،مقتدیٰ الصدر۔جس کی عراق میں مہدی آرمی ہے جو کہ ہزاروں سنی مسلمانوں کی قاتل ہے۔کا کزن ہے)۔

ان واقعات نے شام میں اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی۔شامی مسلمان ایک تو مذہبی حمیت کی وجہ سے کسی نُصیری کو اپنا حکمران ماننے پر تیار نہ تھے دوسری طرف وہ سمجھتے تھے کہ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں نُصیری حکومت نے واقعی اسرائیل کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا جس کے افشا ہونے پر حکومت چھن جانے کے خوف سے حافظ الاسد نے(جو کہ نُصیری وزیر دفاع بھی تھا)اپنی ہی جماعت کے خلاف بغاوت کرڈالی۔

اس کے علاوہ شامی فوج میں نُصیر یوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور تمام عہدوں پر نُصیر یوں کے براجمان ہوجانے پر بھی نہ صرف سنی اکثریت بلکہ دوسری اقلیتیں بھی سخت سیخ پا تھیں۔

تمام سول سرکاری اداروں میں بھی نُصیر یوں کی عملداری تھی جس سے اکثریتی سنی عوام میں بے چینی پائی جاتی تھی۔اس کے علاوہ یہ خیال بھی عام ہے کہ شامی فوج کو طاقتور کرنا اسرائیل کے خلاف نہ تھا بلکہ مستقبل میں ہونے والی کسی سنی بغاوت کو کچلنا تھا۔ اسرائیل مخالف پالیسی صرف سنی اکثریت کے درمیان اپنے اقتدار کو جواز فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اسرائیل کی حیفہ یونیورسٹی کا ماہر لسانیات جان ماہل (John Myhill) لکھتا ہے کہ

"سنی اکثریت کے درمیان اپنے اقتدار کی قانونی و اخلاقی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں اپنے آپ کو عوام کے اندر عرب ازم کا چیمپئن منوانا ضروری ہے جس کی وجہ سے وہ اسرائیل کو دشمن قرار دیتے ہیں اور اس کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔"

لیکن عملاً اسد خاندان اسرائیل سے کسی قضیے میں نہیں الجھنا چاہتا۔ ماہل تو 1973 کی شام، اسرائیل جنگ کو بھی عرب ہمسایوں کے درمیان اپنی "موجودگی برقرار" رکھنے کی کوشش قرار دیتا ہے۔

ماہل مزید لکھتا ہے کہ علویوں کے مذہبی عقائد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ یہودی حامی اور سنی دشمن ہیں اور تو اور اسرائیل کے نقطہ نظر سے بھی یہ ان کے لئے بہتر ہے کہ شام میں نُصیری برسر اقتدار رہیں۔ اگر شام میں سنی اقتدار میں آتے ہیں تو کسی بھی وسیع پیمانے کا فلسطینی، اسرائیل جھگڑا، آپریشن (Cast Lead) کی طرز کے ایک جذباتی ردعمل کو جنم دے گا اور شام کو نتائج کی پرواہ کیے بغیر اسرائیل کے ساتھ ایک بین الاقوامی جنگ میں کھینچ لائے گا۔

وہ مزید لکھتا ہے کہ "شام سرکاری طور پر اسرائیل کے ساتھ کسی امن معاہدے کو کبھی قبول نہ کرے گا۔ ایسا کرنے سے وہ اپنے ہی سنی عوام اور عرب اور اسلامی دنیا میں اپنے اقتدار کا قانونی و اخلاقی جواز ختم کر بیٹھے گا"۔ اگرچہ علوی اور ریاست اسرائیل کے درمیان ایک علانیہ اتحاد ناممکن سی بات ہے۔لیکن یہ امر ناممکن نہیں کہ دونوں ملکوں کے رہنما باہمی رضامندی سے ایسی پالیسی مرتب کریں جو کہ دونوں کے مشترکہ مقاصد "سنیوں کے اثر و رسوخ" کو روکنے میں مددگار ہو۔

جان ماہل کے بیان کردہ بیان کو اگر تاریخی حقائق کے پس منظر میں دیکھا جائے تو قرائن وشواہد اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیتے ہیں کہ شام میں نُصیریوں کی حکومت اسرائیل کے مفاد میں ہے۔شاید اسی لیے مغرب کا رویہ شام میں ہونے والے قتل وغارت سے متعلق مذمتی بیانوں یا چند معاشی پابندیوں سے آگے نہیں بڑھا۔

اسی اضطراب نے 1980ء میں حماۃ شہر میں اس انقلاب کو جنم دیا،جس کا نتیجہ تقریباً تیس ہزار سے زائد مسلمانوں کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا۔حافظ الاسد کے خون آشام نُصیری دستوں نے حماۃ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا۔صرف جیلوں میں موجود 1200 اخوان المسلمین کے قیدیوں کو بغیر مقدمہ چلائے مار دیا گیا،اور حماۃ کے اوپر ٹینک چڑھا دیئے گئے۔

اس سے صرف ایک سال پہلے ایران میں نام نہاد،خودساختہ اسلامی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔

رافضی انقلاب کو ستمبر 1980ء میں عراق کے ساتھ ایک لمبی جنگ میں الجھنا پڑا۔اس تنازع کے دوران شام عرب دنیا کا وہ واحد ملک تھا جس نے ایران کا کھلم کھلا ساتھ دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ اس وقت عراق پر بھی صدام حسین کی قیادت میں بعث پارٹی کی حکومت تھی جو کہ شام میں بھی برسراقتدار تھی۔دونوں کا منشور ''عرب نیشنلزم'' اور ''سوشلزم'' تھا۔اس کے علاوہ شام کے لیے عراق کی جغرافیائی اہمیت ایران سے بڑھ کر تھی،دونوں کی سرحد مشترک تھی اور دونوں اسرائیل دشمنی کے لیے مشہور تھے،پھر بھی اس پورے تنازع کے درمیان ایران کا ساتھ دینا اس بات کی واضح دلیل تھی کہ شام،ملک وملت،سیاسی منشور اور جغرافیائی سرحدوں سے بالاتر ہوکر اپنے ''رافضی'' بھائی کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔

نصیری رافضی،کمیونسٹ تعاون کا ایک مظہر:

آپ کو یاد ہوگا یہاں (پاکستان) کی ایک دہشت گرد تنظیم ''الذوالفقار''،جو کہ بھٹو خاندان کے چشم و چراغ کی سرپرستی کے تحت کام کرتی تھی،1981ء کو کراچی سے پی آئی اے کا ایک طیارہ اغواء کر کے دمشق لے گئی تھی،جہاں اس کو مکمل مدد فراہم کی گئی۔یہیں سے اِس خاندان کو بہوئیں ملیں۔یہ ساری مدد افغان جہاد کے دنوں میں کمیونسٹ کیمپ میں حصہ ڈالنے کے طور پر ہو رہی تھی۔

یہاں پر کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم اس بات کا فیصلہ کرنے لگے ہیں کہ اس آٹھ سالہ جنگ میں عراق حق پر تھا

کیونکہ اس کا ساتھ دوسرے عرب ممالک دے رہے تھے بلکہ یہاں یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ان نُصیریوں کا ''عرب قومیت'' کا نعرہ بھی صرف اپنے عوام کو گمراہ کرنے اور اقتدار کو طول دینے کی ایک کوشش تھی۔ جبکہ ان کے سیاسی اور مذہبی نعرے ''عرب قومیت'' ایران میں بپا ہوئے۔

1979ء کے رافضی انقلاب میں زمین وآسمان کا فرق تھا جو کہ ایک عامی کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں۔ اصل میں اس اتحاد کا مقصد بھی عرب دنیا میں آنے والی کسی سنی تبدیلی (اسلامی تبدیلی) کا راستہ روکنا ہے کیونکہ دونوں ریاستوں کو اصل خطرہ اسرائیل یا امریکہ سے نہیں بلکہ خطے میں اسلامی نظام کے لیے برسر پیکار مسلم قوتوں سے ہے۔

اس کے علاوہ رافضی ایران ہی شام کے نُصیری حکمرانوں کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے بلکہ انہیں اثناعشری شیعہ کا عقائدی حصہ دار سمجھتا ہے۔ اس اتحاد کا ایک مظہر لبنان میں حزب اللہ (اصل میں حزب الشیطان) کی تشکیل ہے جو کہ ایک بدترین رافضی گروہ ہے۔ یہ لبنان میں ہزاروں مسلمانوں کی قاتل ہے۔

اس کو عسکری مدد ایران سے ملتی ہے جب کہ اس کا سیاسی پشتی بان شام کا نُصیری حکمران ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لیے کہ شام کی نُصیری حکومت اصلاً اسرائیل کی پروردہ ہے اور اس کو اصل خطرہ سنی انقلاب سے ہے نہ کہ ریاست اسرائیل سے، اسرائیل کی وزارت خارجہ کے سیاسی اور حفاظتی بیورو کے سربراہ عاموس جلعاد (Amos Gillad) کا یہ بیان ہی کافی ہے جو کہ اس نے 16 نومبر 2011 کو دیا اور اسے کئی عرب اخبارات اور میڈیا رپورٹس نے شہ سرخیوں میں شائع کیا۔ وہ کہتا ہے: ''شامی رہنما (بشار الاسد) کی اقتدار سے رخصتی اسرائیل کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ اگر یہ انقلاب کامیاب ہوگیا تو مشرق وسطیٰ میں اخوان المسلمین کی زیر قیادت ایک نئی اسلامی سلطنت کا آغاز ہوگا جو کہ شام، مصر اور اردن پر مشتمل ہوگی۔ اسرائیل کو ان تینوں ممالک کی طرف سے جنگ کے خطرے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسرائیل کو اس خطرے کا بخوبی اندازہ ہے اس لیے اس نے ترکی سے اپنے مراسم بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اسے مسلمانوں سے جنگ نہ کرنا پڑے۔ اگر اسرائیل کو مابعد انقلاب اسلامی ملکوں سے جنگ کرنا پڑی تو یہ اسرائیل کے مکمل خاتمے پر منتج ہوگا۔''

شام کی یہ پالیسیاں نُصیری اقتدار کے آغاز سے جاری ہیں۔ اس کے علاوہ خود اپنی عوام کے اندر معاشی انقلاب کے نعرے نُصیری فرقے یا اپنے وفاداروں کو نوازنے کے طریقے ہیں۔ شامی فوج کی تقریباً

ساری قیادت نصیری شیعوں پر مشتمل ہے جن کا اول کام سرحدوں سے زیادہ نصیری حکمران کی حفاظت ہے۔

شامی قانون کے مطابق صدر کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ وہ ہر قسم کے احتساب سے بالاتر ہے اور کسی بھی قسم کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے اس کی توہین یا حکم عدولی کی سزا موت ہے۔

فوج کے علاوہ دیگر سول اداروں میں بھی یہی حال ہے۔ سنی جو کہ شامی آبادی کا تقریباً ستر فیصد حصہ ہیں طرح طرح کے مشکلات کا شکار ہیں۔ خاص طور پر وہ علاقے جو کہ 1980ء کے انقلاب میں بڑے سرگرم تھے جیسے کہ حماۃ، درہ، حمص، یہی وجہ ہے کہ موجودہ انقلاب بھی جو کہ مارچ 2011 سے شروع ہوا، انہی شہروں سے شروع ہوا۔ اس کا آغاز چند لڑکوں کی گرفتاری سے ہوا جنہوں نے اپنے چہروں پر اسد مخالف نعرے درج کروائے۔ ان کو پولیس نے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان کی کھالیں ادھیڑ دی گئیں اور چہرے بگاڑ دیے گئے۔ اس واقعے کے خلاف لوگ سراپا احتجاج بن گئے اور سڑکوں پر نکل آئے۔

ان پرامن مظاہرین پر شامی فوج نے گولیاں چلا کر درجنوں کو شہید کر دیا۔

اس ظلم وستم کے باوجود احتجاج کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور نُصیریوں کی ظالم فوج نے سینکڑوں مرد و خواتین کو خون میں نہلا دیا۔ ''درہ'' اور ''حماۃ'' کا محاصرہ کیا گیا اور 1980ء کی طرح اس میں ہونے والے قتل وخون سے دنیا ابھی تک بالکل بے خبر ہے کیونکہ تمام بین الاقوامی، علاقائی اور مقامی میڈیا کو خبر رسانی سے روک دیا گیا ہے۔ سوشل میڈیا جیسے Youtube وغیرہ پر اس بربریت کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی جا سکتی ہے جو کہ رافضی فوجوں نے وہاں روا رکھی ہے۔ حال ہی میں وہ لوگ جنہوں نے شام سے بھاگ کر ترکی کے کیمپوں میں پناہ لی ہے انہوں نے وحشت اور بربریت کی ایسی کہانیاں بیان کیں کہ جن کو سن کر چنگیز اور ہلاکو بھی شرما جائیں۔

مغربی میڈیا اور عینی شاہدین سے ملنے والی رپورٹوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ایران کی انقلابی گارڈ کے فوجی اور بدنامِ زمانہ حزب اللہ کے تربیت یافتہ دہشت گرد اس قتل عام میں شامی حکمرانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ ان نُصیری غنڈوں کی سربراہی بشار الاسد کا چھوٹا بھائی مہر الاسد اور بہنوئی کر رہے ہیں۔

نہتے مظاہرین پر گولہ باری، مشہور سنی علماء کا قتل یا گرفتاری، عورتوں کے ساتھ زیادتی، معصوم بچوں کا قتل، لوگوں کو گھروں میں زندہ جلا دینا، شہروں پر ٹینکوں کے ذریعے چڑھائی اور عوام کو جلاوطن کرنا جیسے ہولناک جرائم اس رافضی گروہ سے سرزد ہو رہے ہیں۔ ان میں سب سے ظالم ''شبابیہ'' ہیں جو کہ ایک طرح کی نجی فوج

ہے جس کے تمام اراکین نُصیر یوں سے چنے جاتے ہیں۔ یہ معصوم سنی مسلمانوں کے خلاف بدترین جرائم کے مرتکب ہوئے۔

دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ہونے والے ظلمِ عظیم پر مسلم دنیا بالکل خاموش ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ عرب لیگ اس ظلم پر آگے بڑھ کر بزورِ قوت اس کا راستہ روکتی، لیکن تا دمِ تحریر وہ مذمتی بیانوں اور معاشی پابندیوں کی دھمکیوں سے آگے نہیں بڑھ پائی۔

مغربی مما لک اس معاملے میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک شام میں کسی ایسے گروپ کے ابھر آنے کا انتظار کر رہے ہیں جو کہ بشار الاسد کی رخصتی کی صورت میں ان کے مفادات کو ضرب نہ پہنچنے دے جن میں سے سب سے اہم ریاستِ اسرائیل کی بقا ہے۔ ایسے کئی گروہوں سے وہ ترکی میں مل چکے ہیں اور اگر مسلم دنیا اور نام نہاد عرب لیگ یونہی خاموش رہی تو پھر ممکن ہے کہ شام کے مسلمان بھی مغرب کی مدد لینے پر مجبور ہو جائیں اور آزادی کی یہ تحریک بھی مغرب ہائی جیک (Hi-jack) کر لے۔ اگر شامی عوام نے خود ہتھیار اٹھا لیے تو ممکن ہے کہ رافضی حکمران اپنے آپ کو اسرائیل کے ساتھ کسی ''مقرر کردہ'' جنگ میں الجھالیں۔ جس کا مظاہرہ ہم ماضی قریب میں حزب اللہ اور اسرائیل جنگ کی صورت میں دیکھ چکے ہیں۔ اس جنگ کا مقصد دنیا کی نظر اس قتل وغارت سے ہٹانا ہوگی جو کہ وہاں جاری ہے۔

ایران کے رافضی ہوں یا امریکہ اور اسرائیل، ان کی نظریں اس اسلامی انقلاب پر لگی ہوئی ہیں جو کہ یک دم سے اس خطے میں امڈ آیا ہے۔ مصر میں اسلامی جماعتوں کی کامیابی نے اس خوف میں اضافہ کر دیا ہے۔ انہیں ہر صورت اس تحریک کا راستہ روکنا ہے۔ اگرچہ امریکہ کے لیے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ ایک اور مسلم ملک پر فوج کشی کر سکے لیکن اسرائیل کا تحفظ بہر حال اس کے لئے مقدم ہے۔ اس لیے اس بات کا خدشہ ہے کہ باہمی رضامندی سے وہ ایک ایسی جنگ شروع کر دے جس کا مقصد جنگ کی آڑ میں اسلامی قوتوں کا خاتمہ ہو۔ یہ صرف قیاس آرائی نہیں بلکہ ان مما لک کے درمیان پائی جانے والی موجودہ مخاصمت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس جنگ کا مقصد نہ صرف اس ظلم سے نظر ہٹانا ہوگا بلکہ رافضہ کو وہ اخلاقی پوزیشن اور عسکری مقام بھی دینا ہوگا جس کی آڑ میں وہ اسلامی سرزمین پر اپنے پنجے گاڑے رکھے۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

احکام و مسائل

عورت کو طلاق کا حق تفویض کرنا، شریعت میں تبدیلی ہے
شریعت سازی کا یہ حق کسی کو حاصل نہیں

حافظ صلاح الدین یوسف[1]

پاکستان میں حکومت کے مجوزہ نکاح فارم کی ایک شق میں یہ درج ہوتا ہے کہ خاوند نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کیا ہے یا نہیں؟

اکثر لوگ تو اس شق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اثبات یا نفی (ہاں یا نہیں) میں کچھ نہیں لکھتے۔ لیکن بعض لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ نکاح کے موقعے پر تفویض طلاق کے اس حق کو تسلیم کیا جائے اور وہ اس شرط کو لکھواتے یعنی منواتے ہیں کہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت جب چاہے اپنے خاوند کو طلاق دے سکتی ہے اور اس طرح کے واقعات اب پیش آنے لگے ہیں کہ ایسی عورتیں جن کو حق طلاق تفویض کیا گیا، انھوں نے اپنے خاوندوں کو طلاقیں

---

[1] مدیر شعبہ تحقیق و تصنیف دار السلام لاہور

دے دیں۔

علمائے احناف اور دیگر فقہا تو اس تفویض طلاق کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ وہ فقہی جمود ہے جس میں وہ مبتلا ہیں، اس لیے عدمِ دلیل کے باوجود وہ اس بنا پر اس کے قائل ہیں کہ ان کے فقہا نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ بنابریں وہ عورت کے طلاق دینے کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔لیکن بعض علمائے اہلحدیث بھی اس کے جواز کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ غالباً انھوں نے مسئلے کا گہرائی سے جائزہ نہیں لیا یا عورتوں کے ''حقوق'' کے شور میں اس کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں کی اس لیے وہ بھی جواز کے قائل ہو گئے۔

راقم کے پاس بھی یہ استفسار آیا اور اس میں بعض علمائے اہلحدیث کی طرف سے اس کے اثبات کا حوالہ بھی دیا گیا۔ اس بنا پر ضرورت محسوس ہوئی کہ مسئلے کی نوعیت کو شرعی دلائل کی روشنی میں واضح اور منقح کیا جائے تا کہ ایک طرف مسلکِ تفویض کے حامل علمائے احناف کے دلائل کی بے ثباتی واضح ہو جائے اور جو علما محض بعض شبہات کی وجہ سے اس کے جواز کے قائل ہیں، وہ بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کر کے صحیح دلائل پر مبنی موقف کو اختیار کر سکیں۔

بہر حال ہمارا موقف یہ ہے کہ عورت کو طلاق کا حق تفویض نہیں کیا جا سکتا اور اگر کسی نے اس کو یہ حق دے دیا اور عورت نے اسے استعمال کرتے ہوئے خاوند کو طلاق دے دی، تو یہ طلاق نہیں ہوگی۔ طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے، یہ حق اللہ نے صرف اُسے ہی عطا کیا ہے، اسے پوری اُمت مل کر بھی عورت کی طرف منتقل کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

اسلام میں طلاق کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے، عورت کو نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں زود رنج، زود مشتعل اور جلد بازی میں جذباتی فیصلہ کرنے والی ہے، نیز عقل اور دور اندیشی میں کمزور ہے۔ عورت کو بھی حق طلاق دیے جانے کی صورت میں، یہ اہم رشتہ جو خاندان کے استحکام و بقا اور اس کی حفاظت و صیانت کے لیے بڑا ضروری ہے، تارِ عنکبوت سے زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوتا۔ علمائے نفسیات و طبیعیات بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل راقم کی کتاب ''خواتین کے امتیازی

مسائل‘‘ مطبوعہ دار السلام میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اگر عورت کو بھی طلاق کا حق مل جاتا تو وہ اپنا یہ حق نہایت جلد بازی یا جذبات میں آکر استعمال کر لیا کرتی اور اپنے پیروں پر آپ کلہاڑا مار لیا کرتی۔ اس سے معاشرتی زندگی میں جو بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا، اس کا تصور ہی نہایت روح فرسا ہے۔ اس کا اندازہ آپ مغرب اور یورپ کی اُن معاشرتی رپورٹوں سے لگا سکتے ہیں جو وہاں عورتوں کو حق طلاق مل جانے کے بعد مرتب اور شائع ہوئی ہیں۔

ان رپورٹوں کے مطالعے سے اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور عورت کی اس کمزوری کا اثبات ہوتا ہے جس کی بنا پر مرد کو تو حق طلاق دیا گیا ہے لیکن عورت کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ عورت کی جس زود رنجی، سریع الغضبی، ناشکرے پن اور جذباتی ہونے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، احادیث سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[ورأيت النار فإذا أكثر أهلها النساء يكفرن ،قيل: أيكفرن بالله؟ قال:يكفرن العشير ويكفرن الإحسان، لو أحسنت إلى إحداهن الدهر ثم رأت منك شيئا، قالت: ما رأيت منك خير قط] [1]

’’میں نے جہنم کا مشاہدہ کیا تو اس میں اکثریت عورتوں کی تھی (اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ ناشکری کا ارتکاب کرتی ہیں۔ پوچھا گیا: کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا: (نہیں) وہ خاوند کی ناشکری اور احسان فراموشی کرتی ہیں۔ اگر تم عمر بھر ایک عورت کے ساتھ احسان کرتے رہو، پھر وہ تمہاری طرف سے کوئی ایسی چیز دیکھ لے جو اسے ناگوار ہو تو وہ فوراً کہہ اُٹھے گی کہ میں نے تو تیرے ہاں کبھی بھلائی اور سکھ دیکھا ہی نہیں۔‘‘

جب ایک عورت کی افتادِ طبع اور مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ عمر بھر کے احسان کو مرد کی کسی ایک بات پر فراموش کر دیتی ہے تو اسے اگر حق طلاق مل جاتا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس آسانی کے ساتھ وہ اپنا گھر اُجاڑ لیا کرتی؟

عورت کی اس کمزوری، کم عقلی اور زود رنجی ہی کی وجہ سے مرد کو اس کے مقابلے میں صبر و ضبط، تحمل اور

[1] صحیح البخاری، الایمان، باب کفران العشیر ......، حدیث:29

قوت برداشت سے کام لیتے ہوئے عورت کے ساتھ نباہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ عورت کی یہ کمزوریاں فطری ہیں، کسی مرد کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ قوت کے زور سے اُن کمزوریوں کو دور کرکے عورت کو سیدھا کردے یا سیدھا رکھ سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

[استوصوا بالنساء، فإن المرأة خلقت من ضلع، وإن أعوج شيء في الضلع أعلاه، فإن ذهبت تقيمه كسرته، وإن تركته لم يزل أعوج،فاستوصوا بالنساء][1]

''عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت مانو،عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے،اورسب سے زیادہ کجی اوپر کی پسلی میں ہوتی ہے، پس اگر تم اُسے سیدھا کرنے لگو گے تو اسے توڑ دو گے اور یوں ہی چھوڑ دو گے تو کجی باقی رہے گی، پس عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت قبول کرو۔''

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ عورت کے مزاج میں کجی (ٹیڑھا پن) ہے (جو ضد وغیرہ کی شکل میں بالعموم ظاہر ہوتی رہتی ہے)، پس اس کمزوری میں اسے معذور سمجھو کیونکہ یہ پیدائشی ہے، اسے صبر اور حوصلے سے برداشت کرو اور اُن کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرو۔ اگر تم اُنھیں سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اُن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکو گے جبکہ اُن کا وجود انسان کے سکون کے لیے ضروری ہے اور کشمکشِ حیات میں اُن کا تعاون ناگزیر ہے، اس لیے صبر کے بغیر اُن سے فائدہ اٹھانا اور نباہ ناممکن ہے۔''[2]

بہر حال عورت کی یہی وہ فطری کمزوری ہے جس کی وجہ سے اللہ نے مرد کو تو حق طلاق دیا ہے لیکن عورت کو نہیں دیا۔ عورت کا مفاد ایک مرد سے وابستہ اور اس کی رفیقۂ حیات بن کر رہنے ہی میں ہے نہ کہ گھر اجاڑنے میں۔ اور عورت کے اس مفاد کو عورت کے مقابلے میں مرد ہی صبر و ضبط اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرکے زیادہ ملحوظ رکھتا اور رکھ سکتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، احادیث الانبیاء، باب خلق آدم و ذریتہ، حدیث: 3331

[2] فتح الباری 315/9، مطبوعہ دار السلام

بنابریں اسلام کا یہ قانونِ طلاق بھی دراصل عورت کے مفاد ہی میں ہے، گو عورت آج کل پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس کی حکمت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں عورت کے لیے حق خلع

تاہم اسلام چونکہ دین فطرت اور عدل و انصاف کا علم بردار ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کسی وقت عورت کو بھی مرد سے علیحدہ ہونے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، جیسے خاوند نامرد ہو، وہ عورت کے جنسی حقوق ادا کرنے پر قادر نہ ہو، یا وہ نان ونفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو، یا قادر تو ہو لیکن بیوی کو مہیا نہ کرتا ہو، یا بلاوجہ اس پر ظلم و ستم یا مار پیٹ سے کام لیتا ہو، یا عورت اپنے خاوند کو ناپسند کرتی اور محسوس کرتی ہو کہ وہ اس کے ساتھ نباہ یا اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرسکتی۔

ان صورتوں یا اِن جیسی دیگر صورتوں میں عورت خاوند کو یہ پیشکش کرکے کہ تو نے مجھے جو مہر اور ہدیہ وغیرہ دیا ہے، وہ میں تجھے واپس کردیتی ہوں تو مجھے طلاق دے دے، اگر خاونداس پر رضامند ہو کر اُسے طلاق دے دے تو ٹھیک ہے لیکن اگر خاوند ایسا نہیں کرتا تو اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ عدالت یا پنچایت کے ذریعے سے اس قسم کی صورتوں میں خاوند سے گلوخلاصی حاصل کرلے، اِس کو خلع کہتے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ سے ثابت ہے، اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، راقم کی کتاب ''خواتین کے امتیازی مسائل'' میں اس کے دلائل تفصیل سے مذکور ہیں۔

عورت کے اس حق خلع کی موجودگی میں اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ نکاح کے موقعے پر مرد اپنا حق طلاق عورت کو تفویض کرے، کیونکہ اسلام نے عورت کے لیے بھی قانونِ خلع کی صورت میں مرد سے علیحدگی کا طریقہ بتلا دیا ہے اور عہدِ رسالت میں بعض عورتوں نے اپنا یہ حق استعمال بھی کیا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحیثیتِ حاکم وقت خلع کا فیصلہ ناپسندیدہ خاوند سے علیحدگی کی صورت میں فرمایا ہے جس کی تفصیل صحیح احادیث میں موجود ہے۔

علمائے احناف کا فقہی جمود، خلع کا انکار

لیکن بدقسمتی سے قرآن وحدیث کے مقابلے میں آرا الرجال کو زیادہ اہمیت دینے والے علماء وفقہاء، اسلام کے اس قانونِ خلع کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیے فقہ حنفی میں مذکورہ صورتوں میں سے کسی بھی صورت

میں عورت کے لیے مرد سے گلوخلاصی حاصل کرنے کا جواز نہیں ہے، اس کا اعتراف مولانا تقی عثمانی صاحب (دیو بندی) نے بھی کیا ہے۔ [1]

مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے بھی مذکورہ کتاب اسی لیے تحریر فرمائی تھی کہ عورتوں کی مشکلات کا کوئی حل، جو کہ فقہ حنفی میں نہیں ہے، تلاش کیا جائے، چنانچہ اُنھوں نے کچھ فقہی جمود توڑتے ہوئے دوسری فقہوں کے بعض مسائل کو اختیار کر کے بعض حل پیش فرمائے اور دیگر علمائے احناف کی تصدیقات بھی حاصل کیں۔ اس کے باوجود علمائے احناف کا جمود برقرار رہے کہ جب تک خاوند کی رضا مندی حاصل نہ ہو، عورت کے لیے علیحدگی کی کوئی صورت نہیں۔ [2]

حالانکہ عورت کو حق خلع دیا ہی اس لیے گیا ہے کہ خاوند راضی ہو یا راضی نہ ہو، عورت عدالت یا پنچایت کے ذریعے سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے اور عدالت کا فیصلہ طلاق کے قائم مقام ہو جائے گا۔

فقہائے احناف کی شریعت سازی

شریعت کے دیے ہوئے حق خلع کو تو فقہائے احناف نے تسلیم نہیں کیا جو ایک ناگزیر ضرورت ہے، البتہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اپنی طرف سے یہ طریقہ تجویز کیا کہ عورت کو حق طلاق تفویض کر دیا جائے جو حکم الٰہی میں تبدیلی اور شریعت سازی کے مترادف ہے، حالانکہ عورت کو حق طلاق دینے میں جو شدید خطرات ہیں، وہ مسلمہ ہیں اور اُنہی کے پیش نظر اللہ عزوجلّ نے یہ حق عورت کو نہیں دیا۔ قابل غور امر یہ ہے کہ جو حق اللہ نے نہیں دیا، اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں دیا تو وہ اور کون سی اتھارٹی ہو سکتی ہے جو یہ حق عورتوں کو دے دے؟ یقیناً ایسی کوئی اتھارٹی نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس لیے اس تفویض طلاق کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت انسانوں کے اپنے تفویض کردہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خاوند کو طلاق دے دیتی ہے تو اس طرح قطعاً طلاق واقع نہیں ہو گی۔ نکاح ایک میثاقِ غلیظ (نہایت مضبوط عہد) ہے جو حکم الٰہی کے تحت طے پاتا ہے، اسے خود ساختہ طریقے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عہد اسی وقت ختم ہو گا جب اس کے ختم کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے گا جو خود اللہ نے بتلایا ہے اور وہ طریقہ صرف اور صرف

---

[1] ملاحظہ ہو مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة" کے نئے ایڈیشن [ادارئہ اسلامیات] کا پیش لفظ، از مولانا تقی عثمانی

[2] دیکھیے: درس ترمذی 3 / 497 از مولانا تقی عثمانی

مرد کا طلاق دینا یا عورت کا خلع لینا ہے۔ اس کے علاوہ رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

کون سی شرطیں قابل اعتبار یا ناقابل اعتبار ہیں؟

اس تفویض طلاق کے جواز میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ نکاح کے موقعے پر جو شرطیں طے پائیں، ان کا پورا کرنا ضروری ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

[أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج] [1]

''جن شرطوں کا پورا کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعے سے تم شرم گاہیں حلال کرو۔''

یہ حدیث اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن اس سے مراد وہ شرطیں ہیں جن سے مقاصدِ نکاح کو مزید مؤکد کرنا مقصود ہو، جیسے خود امام بخاری رحمہ اللہ نے اُس کو مہر کی ادائیگی کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح کسی مرد سے یہ اندیشہ ہو کہ وہ نان نفقہ میں کوتاہی کرے گا یا شاید حسن سلوک کے تقاضے پورے نہیں کرے گا، یا رشتے داروں سے میل ملاپ میں ناجائز تنگ کرے گا، وغیرہ؛ تو نکاح کے موقعے پر اس قسم کی شرطیں طے کر لی جائیں تو اُن کا پورا کرنا مرد کے لیے ضروری ہوگا۔ یہ حدیث اسی قسم کی شرطوں تک محدود رہے گی۔

اس کے برعکس اگر خاوند یہ شرط عائد کرے کہ وہ بیوی کے نان نفقہ کا ذمے دار نہیں ہوگا، شادی کے بعد وہ ماں باپ یا بہن بھائیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دے گا، یا میں اس کو پردہ نہیں کرنے دوں گا، وعلیٰ ہذا القیاس اس قسم کی ناجائز شرطیں، تو وہ کالعدم ہوں گی، یا عورت یہ شرط عائد کرے کہ وہ خاوند کو ہم بستری نہیں کرنے دے گی تاکہ بچے پیدا نہ ہوں، یا خاوند کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، یا مردوں کے ساتھ مخلوط ملازمت سے وہ نہیں روکے گا وغیرہ وغیرہ۔ تو ان شرطوں کا بھی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ یہ ناجائز شرطیں ہیں یا مقاصدِ نکاح کے منافی ہیں۔ اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کو کہ ''عورت اپنی سوتن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ وہ اس کا برتن اُلٹائے۔'' یعنی سہولیاتِ زندگی سے محروم کر دے جو خاوند کے ہاں اس کو میسّر ہیں۔ (حدیث: 2723) کتاب الشروط کے باب ''مالا یجوز من الشروط فی النکاح'' یعنی ''ان شرطوں کا بیان جو نکاح میں جائز نہیں'' میں ذکر کیا ہے، اس کا صاف

---

[1] صحیح البخاری: الشروط، باب الشروط فی المہر عند عقدۃ النکاح، حدیث: 2721

مطلب یہ ہے کہ شریعت کے عطا کردہ کسی حق کو ختم کرنے کی شرط عائد کی جائے گی تو اُس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ بلکہ اس قسم کی شرطوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا ہے:

والمسلمون علی شروطھم إلا شرطا حرم حلالا أو احل حراما[1]

''مسلمانوں کے لیے اپنی طے کردہ شرطوں کی پابندی ضروری ہے، سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کردے۔ (ایسی شرطیں کالعدم ہوں گی)۔''

نکاح کے موقع پر تفویض طلاق کی شرط بھی، شرطِ باطل ہے جس سے مرد کا وہ حق جو اللہ نے صرف مرد کو دیا ہے، وہ اس سے ختم ہو کر عورت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مرد کے اس حق شرعی کا عورت کی طرف انتقال، حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینے ہی کے مترادف ہے جس کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ اس شرط سے عورت کو طلاق دینے کا حق قطعاً حاصل نہیں ہو سکتا، اُس کو اس قسم کے حالات سے سابقہ پیش آئے تو وہ، شرط کے باوجود، طلاق دینے کی مجاز نہیں ہوگی بلکہ طلاق لینے، یعنی خلع کرنے ہی کی پابند ہوگی۔

عہدِ رسالت کا ایک واقعہ اور فیصلہ کن فرمانِ رسول ﷺ

اس مسئلے میں نبی ﷺ کے زمانے کا ایک واقعہ ہماری بڑی رہنمائی کرتا ہے۔ بریرہ ایک لونڈی تھی اور مُکاتَبَہ تھی، یعنی مالکوں کے ساتھ اس کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ اتنی رقم تو ادا کردے گی تو ہماری طرف سے آزاد ہے۔ بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اُمّ المومنین! آپ مجھے خرید کر آزاد کردیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ بریرہ نے کہا: لیکن میرے آقا کہتے ہیں کہ حق وَلاء ان کا ہوگا۔ (ورثاء کی عدم موجودگی میں وراثت وغیرہ کے حق کو وَلاء کہا جاتا ہے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: مجھے حق ولاء کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ یہ بات نبی ﷺ نے سن لی یا آپ تک پہنچ گئی تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

[اشتریھا فأعتقیھا ودعیھم یشترطوا ما شاؤا]

''اُس کو خرید کر آزاد کردے اور مالکوں کو چھوڑ، وہ جو چاہے شرط کرلیں۔''

---

[1] جامع الترمذي: کتاب الاحکام، حدیث:1352

چنانچہ حضرت عائشہ نے حضرت بریرہ کو قیمت ادا کر کے آزاد کر دیا اور اس کے مالکوں نے ولاء کی شرط کر لی کہ وہ ہمارا حق ہوگا۔لیکن نبی ﷺ نے فرمایا:

[الولاء لمن أعتق وإن اشترطوا مائة شرط][1]

''حق ولاء آزاد کرنے والے کا ہے، چاہے مالک سو شرطیں لگا لیں۔''

ایک اور مقام پر آپ کا یہ فرمان بایں الفاظ منقول ہے:

[ما بال رجال يشترطون شروطا ليست في كتاب الله؟ ما كان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل وإن كان مائة شرط، قضاء الله أحق وشرط الله أوثق وإنما الولاء لمن أعتق][2]

''لوگوں کا کیا حال ہے، وہ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں؟ (یاد رکھو) جو شرط ایسی ہو گی جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہے، وہ باطل ہے اگرچہ سو شرطیں ہوں۔ اللہ کا فیصلہ زیادہ حق دار ہے (کہ اس کو مانا جائے) اور اللہ کی شرط زیادہ مضبوط ہے (کہ اس کی پاسداری کی جائے) ولاء اسی کا حق ہے جس نے اسے آزاد کیا''۔

اس حدیث میں آپ نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جو شرط بھی کتاب اللہ میں نہیں ہے، یعنی شریعتِ اسلامیہ کی تعلیمات کے خلاف ہے، وہ باطل ہے اور باطل کا مطلب کالعدم ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

علاوہ ازیں اللہ تبارک تعالیٰ نے احکامِ وراثت بیان فرما کر ان کی بابت کہا کہ یہ اللہ کی حدیں ہیں اور اس کے بعد فرمایا

(وَمَن يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدۡخِلۡهُ نَارًا) (سورۃ النساء4:14)

''جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا تو اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا۔''

---

[1] صحیح البخاری: المکاتب، حدیث:2565

[2] صحیح البخاری: البیوع، باب:73، حدیث:2168

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے مقررہ حصہ ہائے وراثت میں تبدیلی کرنا، اللہ کی حدوں سے تجاوز اور اللہ رسول کی نافرمانی ہے جس کی کسی کو اجازت نہیں۔

اسی طرح اللہ نے طلاق اور خلع کے احکام بیان کر کے فرمایا:

(تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ)

سورۃ البقرۃ 229:2

''یہ اللہ کی حدیں ہیں، سوتم اُن سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا، وہ لوگ ظالم ہیں۔''

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ طلاق وخلع کے احکام، حدود اللہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں تبدیلی کرنا، یعنی عورت کو حق خلع کے بجائے، جو کہ اسے اللہ نے دیا ہے، طلاق کا حق تفویض کر دینا، حدود اللہ میں تجاوز کرنا ہے جس کا حق کسی کو حاصل نہیں، یہ سراسر ظلم ہے جو اللہ کو ناپسند ہے۔

چنانچہ آیت مذکورہ: (تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا) کے تحت مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے لکھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے:

''یہ تاکید ہے اس امر کی کہ احکامِ شرعی میں کسی خفیف جزئیہ کو بھی ناقابل التفات نہ سمجھا جائے اور شریعت جیسے بے انتہا منظم فن میں ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ مشین جتنی نازک اور اعلیٰ صَنّاعی کا نمونہ ہوگی، اسی قدر اس کا ایک ایک تنہا پرزہ بھی اپنی جگہ پر بے بدل ہوگا۔''[1]

بنابریں عورت کو طلاق کا حق تفویض کرنا، امر باطل ہے۔ اس سے حکم شریعت میں تبدیلی لازم آتی ہے، مرد کا جو حق ہے وہ عورت کو مل جاتا ہے اور عورت جو مرد کی محکوم ہے، وہ حاکم (قوّام) بن جاتی ہے اور مرد اپنی قوّامیت کو (جو اللہ نے اسے عطا کی ہے) چھوڑ کر محکومیت کے درجے میں آ جاتا ہے، یا بالفاظِ دیگر عورت طلاق کی مالک بن کر مرد بن جاتی ہے اور مرد عورت بن جاتا ہے کہ بیوی اگر اسے طلاق دے دے تو وہ سوائے اپنی بے بسی اور بے چارگی پہ رونے کے کچھ نہیں کر سکتا

تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ (سورۃ النجم:22)

---

[1] تفسیر ماجدی 92/1، طبع تاج کمپنی

چند شبہات و اشکالات کا ازالہ

1 بعض علماء آیتِ تخییر سے تفویض طلاق کا جواز ثابت کرتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

آیتِ تخییر سے مراد وہ واقعہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اَزواجِ مطہرات کے درمیان پیش آیا کہ جب فتوحات کے نتیجے میں مالِ غنیمت کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت قدرے بہتر ہوئی تو ازواجِ مطہرات نے بھی اپنے نان ونفقہ میں اضافے کا مطالبہ کردیا جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہ آیا۔ اس موقعے پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

(يَأَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِأَزْوَجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدنَ الحَيوةَ الدُّنيا وَزِينَتَها فَتَعالَينَ أُمَتِّعكُنَّ وَأُسَرِّحكُنَّ سَراحًا جَميلًا) سورۃ الاحزاب:28:33

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے: اگر تم دنیا اور اس کی زینت کی طالب ہو، تو آؤ میں تمھیں کچھ متعہ (فائدہ) دے کر تمھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیتا ہوں، یعنی طلاق دے دیتا ہوں۔''

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ سمیت تمام ازواجِ مطہرات کو اختیار دے دیا کہ تم دنیا چاہتی ہو یا آخرت؟ اگر دنیا کی آسائشیں مطلوب ہیں تو میں تمھیں طلاق اور کچھ متعۂ طلاق دے کر آزاد کردیتا ہوں لیکن سب نے دنیا کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حبالۂ عقد ہی میں رہنے کو پسند کیا۔

یہ آیتِ تخییر کہلاتی ہے۔ اس سے تفویض طلاق کا اثبات نہیں ہوتا کیونکہ اس میں تو اُن کے مطالبات کے جواب میں اُنھیں یہ اختیار دیا گیا کہ اگر تمھیں اپنے مطالبات پورے کرانے پر اصرار ہے تو میں زبردستی تمھیں اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں کرتا، میں تمھیں طلاق دے دیتا ہوں، قرآن کے الفاظ واضح ہیں ''آؤ میں تمھیں متعۂ طلاق اور طلاق دے کر چھوڑ دیتا ہوں۔'' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنے کے بجائے دنیا کی آسائشیں پسند کرتیں تو آپ ان کو طلاق دے کر اپنے سے جدا کر دیتے۔ از خود ان کو طلاق نہ ہوتی۔

اس سے مستقل طور پر عورت کو طلاق کا حق تفویض کرنے کا اثبات ہرگز نہیں ہوتا۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت اگر کچھ ایسے مطالبات پیش کرے جس کو خاوند پورا نہ کرسکتا ہو تو وہ بیوی سے یہ کہے

کہ میں یہ مطالبات پورے نہیں کرسکتا، اگر تو انھی حالات کے ساتھ گزارا کرسکتی ہے تو ٹھیک ہے، بصورتِ دیگر میں طلاق دیکر اچھے طریقے سے تجھے فارغ کر دیتا ہوں۔ اگر عورت دوسری (طلاق کی) صورت اختیار کرتی ہے تو اسے طلاق نہیں ہوجائے گی بلکہ خاوند اس کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے طلاق دے تبھی طلاق، یعنی علیحدگی ہوگی۔

اس صورت کا تفویض طلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے اس آیت سے استدلال یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

2 أَمْرُكِ بِيَدِكِ (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے)؟

اس سے ملتی جلتی ایک دوسری صورت یہ ہے کہ جھگڑے کے موقع پر خاوند عورت کو یہ کہہ دے: أَمْرُكِ بِيَدِكِ (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے)

اس سے بھی بعض لوگوں نے تفویض طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ حالانکہ یہ طلاق کنائی کی ایک صورت بنتی ہے۔ اور اکثر فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں لیکن یہ تفویض نہیں بلکہ طلاق ہے۔

نیز اوّل تو یہ الفاظ نہ مرفوعاً ثابت ہیں اور نہ موقوفاً، یعنی یہ نہ حدیثِ رسول ﷺ ہے اور نہ کسی صحابی کا قول[1] یہ الفاظ جامع ترمذی، سنن ابی داود اور سنن نسائی میں منقول ہیں۔ ان سب کی سندیں ضعیف ہیں تاہم اسے حسن بصری رحمہ اللہ کا قول قرار دیا گیا ہے۔ (اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

البتہ بعض صحابہ کے ان الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ سے بھی استدلال کیا گیا ہے، مثلاً: المعجم الکبیر للطبرانی (9/379، 9627) میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے:

[إذا قال الرجل لامرَأته: أمركِ بيدكِ أو استفلحي بأمرك أووهبها لأهلها فقبلوها فهي واحدة بائنة][2]

''اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے: تیرا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے، یا تم اپنے معاملے میں کامیاب ہو

---

[1] مفصل ضعیف سنن ابی داؤد، للألبانی 10/234، رقم: 379

[2] ماہنامہ "الحدیث" حضرو، مئی 2013ء

جاؤ، یا وہ اس (حق) کو اس بیوی کے گھر والوں کے حوالے کر دے، پھر وہ اسے قبول کر لیں تو یہ ایک (طلاق) بائن (نکاح کو ختم کر دینے والی) ہے۔''

اس اثر میں غور کریں، کیا اس کا تعلق زیر بحث تفویض طلاق سے ہے؟ قطعاً نہیں۔ اس میں بھی وہی خیارِ طلاق (طلاقِ کنائی) یا توکیل کی صورت ہے کہ اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں خاوند بیوی کو اختیار دے دے کہ اگر تو میرے پاس رہنے کے لیے تیار نہیں ہے تو تجھے اختیار ہے کہ تو خود میرے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ کر لے۔ اگر وہ علیحدگی کا فیصلہ کر لیتی ہے تو مذکورہ اثر کی بنیاد پر اسے طلاق ہو جائے گی اور بقول عبداللہ بن مسعود یہ ایک طلاق بائن ہو گی۔ یہ خیارِ طلاق سے ملتی جلتی وہی صورت ہے جس کی تفصیل آیتِ تخییر کے ضمن میں گزری ہے یا یہ طلاق بالکنایہ ہے کیونکہ یہ طلاق کون سی ہو گی؟ یہ خاوند کی نیت پر منحصر ہے جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

دوسری صورت اس میں توکیل کی ہے، یعنی بیوی کے گھر والوں کو طلاق دینے کا حق دے دے اور وہ طلاق دے دیں، تو طلاق بائن ہو جائے گی۔ وکالت کو بھی شریعت نے تسلیم کیا ہے، یعنی خاوند خود طلاق نہ دے بلکہ وکیل کے سپرد یہ کام کر دے، تو وہ طلاق خاوند ہی کی طرف سے تسلیم کی جائے گی۔ مذکورہ اثر میں یہی دو صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک صورت خیارِ طلاق کی سی ہے بلکہ یہ طلاق بالکنایہ ہے اور دوسری توکیل طلاق کی۔ اس اثر سے زیر بحث تفویض طلاق کا اثبات ہر گز نہیں ہوتا۔

دوسرا اثر، جس سے استدلال کیا گیا ہے، حسب ذیل ہے:

''سیدنا عثمان کے پاس وفد میں ابوالحلال العتکی رحمہ اللہ آئے، تو کہا: ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اس کا اختیار دے دیا ہے؟ اُنھوں نے فرمایا: ''فأمر ها بیدها'' پس اس عورت کا اختیار اس کے پاس ہی ہے۔''[1]

میں بھی وہی خیارِ طلاق بلکہ طلاق بالکنایہ کا اثبات ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں، یعنی لڑائی جھگڑے کی صورت میں عورت کو علیحدگی کا اختیار کنائے کی صورت میں دے دینا، اس اثر کا بھی تفویض طلاق کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ 56/5، حدیث: 18071

تیسرا اثر، جس سے استدلال کیا گیا ہے، حسبِ ذیل ہے:

''سیدنا عبداللہ بن عمر سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو اس کا اختیار دے دیا تو انھوں نے فرمایا: "القضاء ما قضت فإن تناکرا احلف" وہ عورت جو فیصلہ کرے گی وہی فیصلہ ہے، پھر اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا انکار کریں تو مرد کو قسم دی جائے گی۔''[1]

یہ اثر نقل کر کے فاضل مفتی حفظہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں پر چونکہ یہ اختیار نکاح نامے پر شوہر کے دستخطوں اور گواہوں کے ساتھ لکھا ہوا ہے، لہٰذا یہاں کسی قسم کے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''[2]

لیکن اس اثر میں بھی پہلے قابل غور بات تو یہ ہے کہ اس میں بھی طلاق بالکنایہ والا مسئلہ ہی بیان ہوا ہے یا تفویض طلاق کا؟ واقعے پر غور فرما لیا جائے، اس میں بھی طلاق کنائی یا خیارِ طلاق ہی کا مسئلہ بیان ہوا ہے جس کا شادی کے بعد ہونے والے میاں بیوی کے درمیان شدید جھگڑے سے ہے کہ اگر اختلافات کا کوئی حل نہ نکلے تو خاوند اس کا یہی حل پیش کرے کہ تجھے اختیار ہے میرے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا۔ اس صورت میں ظاہر بات ہے کہ عورت جو فیصلہ کرے گی وہی نافذ ہوگا۔ علیحدگی پسند کرے گی تو طلاق ہو جائے گی، بصورتِ دیگر نہیں۔ لیکن اس طلاق میں بھی فیصلہ کن بات خاوند کی نیت ہی ہے کہ طلاق رجعی ہے یا بائن؟

اس اثر سے بھی رشتۂ ازدواج میں جڑنے سے پہلے ہی نکاح کے موقعے پر مرد کا اپنے اس حق طلاق سے دست بردار ہو کر، جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے، عورت کو اس کا مالک بنا دینا، کس طرح ثابت ہوتا ہے؟

میاں بیوی کے درمیان عدمِ موافقت کی صورت میں ان کے اختلافات دور کرنے کے کئی طریقے ثابت ہیں۔ ایک یہ ہے جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے کہ ایک ثالث (حَکَم) بیوی کی طرف سے اور ایک خاوند کی طرف سے مقرر کیے جائیں، وہ دونوں کے بیانات سن کر فیصلہ کریں اور دونوں کی کوتاہیوں کو معلوم کر کے ان کو دور کرنے کی تلقین دونوں کو کریں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ بطورِ وکالت ان کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ کر دیں۔ اس کو ''توکیل بالفرقۃ'' کہا جاتا ہے، یہ وکالت کی وہ صورت ہے جو جائز ہے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ 9/581، حدیث: 18388

[2] ماہنامہ "الحدیث، حضرو، مئی 2013ء

دوسری صورت خیارِ طلاق کی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ازواجِ مطہرات علیحدگی کو پسند کرتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو طلاق دے کر فارغ کر دیتے۔

تیسری صورت یہ ہے جو بعض آثارِ صحابہ سے ثابت ہے کہ خاوند علیحدگی کا معاملہ عورت کے سپرد کر دے: اَمْرُکِ بِیدِک (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں) مذکورہ سارے آثار کا تعلق اسی صورت سے ہے۔ اس جملے کی بابت فقہا کہتے ہیں اور مذکورہ آثارِ صحابہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اگر عورت علیحدگی اختیار نہیں کرتی اور خاوند ہی کے پاس رہنے کو اختیار کرتی ہے تو طلاق نہیں ہوگی اور اگر وہ علیحدگی کا فیصلہ کرتی ہے تو یہ طلاق شمار ہوگی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ طلاق ایک ہوگی یا تین طلاقیں۔ ایک طلاق ہونے کی صورت میں رجعی ہوگی یا بائنہ؟ بعض آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاوند کی نیت کے مطابق فیصلہ ہوگا، اگر اس سے مراد اس کی ایک طلاقِ رجعی ہے تو یہ ایک طلاقِ رجعی شمار ہوگی اور خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس میں خاوند کی نیت کے فیصلہ کن ہونے نے اس کو طلاق بالکنایہ بنا دیا ہے اور یوں یہ خیارِ طلاق سے مختلف صورت ہے کیونکہ اسے اگر خیارِ طلاق کی وہی صورت قرار دیں جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں اختیار فرمایا تھا تو اس میں بھی طلاق کا حق مرد ہی کو حاصل تھا، اور اَمْرُکِ بِیدِک میں یہ اختیار عورت کو دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ طلاقِ کنائی بنے گی اس لیے کہ یہ طلاق، طلاقِ رجعی ہوگی یا بائنہ؟ اس کا فیصلہ خاوند کی نیت کے مطابق ہوگا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس محمد بن عتیق نامی ایک شخص آیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت زید نے پوچھا: کیا بات ہے، روتے کیوں ہو؟ اُس نے کہا: میں نے اپنی عورت کو اس کے معاملے کا مالک بنا دیا تھا تو اُس نے مجھ سے جدائی اختیار کر لی ہے۔ حضرت زید نے پوچھا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگا: بس اسے تقدیر ہی سمجھ لیں۔ حضرت زید نے فرمایا: اگر تو رجوع کرنا چاہتا ہے تو رجوع کر لے، یہ ایک ہی طلاق ہے اور تو رجوع کرنے کا اس عورت سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔

اور حضرت زید بن ثابت کا ایک دوسرا قول یہ نقل ہوا ہے اور اسے حضرت عثمان اور حضرت علی کا بھی قول بتلایا گیا ہے کہ "القضاء ما قضت" (عورت جو فیصلہ کرے گی وہی فیصلہ ہوگا)، یعنی اس کے کہنے کے مطابق اسے طلاقِ رجعی یا بائنہ، ایک یا تین شمار کیا جائے گا کیونکہ معاملہ اس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

اور ایک تیسری رائے حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر عورت اسے تین طلاق شمار کرے اور خاوند کہے کہ عورت کو طلاق کا مالک بناتے وقت میری نیت ایک طلاق کی تھی، تین طلاق کا انکار کرے جس کا فیصلہ عورت نے کیا تھا، تو خاوند سے قسم لی جائے گی اور پھر اسے ایک ہی طلاق شمار کر کے خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق دیا جائے گا۔[1]

ان آثار سے، قدرے اختلاف کے باوجود، یہ واضح ہے کہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں عورت کو علیحدگی کا اختیار دینا، زیر بحث تفویض طلاق سے یکسر مختلف معاملہ ہے جس کا جواز ان آثار سے کشید کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ أَمْرُكِ بِيَدِكِ کی صورت یا تو توکیل کی بنتی ہے کہ مرد کسی اور کو وکیل بنانے کے بجائے عورت ہی کو وکیل بنا دیتا ہے یا یہ کنائی صورت ہے کیونکہ اس میں فیصلہ کن رائے خاوند ہی کی ہوگی کہ اگر عورت نے علیحدگی پسند کر لی ہے تو یہ کون سی طلاق شمار ہوگی، رجعی یا بائنہ، ایک یا تین؟ ایک رجعی شمار کرنے کی صورت میں خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

اس سے زیر بحث تفویض طلاق کا اثبات کرنے والوں سے ہمارے چند سوال ہیں:

1. تفویض طلاق والی عورت اگر خاوند کو طلاق دے دیتی ہے تو کیا اس میں خاوند کی نیت کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟
2. اگر خاوند کہے کہ میری مراد اس تفویض طلاق سے ایک طلاقِ رجعی تھی، تو کیا خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا؟
3. اور اگر رجوع کا حق حاصل ہوگا تو پھر تفویض طلاق کی شق ہی بے معنیٰ ہو جاتی ہے، کیونکہ جو عورت بھی اس حق کو استعمال کرتے ہوئے خاوند کو طلاق دے گی تو خاوند رجوع کر لیا کرے گا۔
4. اگر تفویض طلاق میں طلاقِ بائنہ ہوگی تو پھر یہ صورت أَمْرُكِ بِيَدِكِ میں کس طرح آسکتی ہے جس کو اس کے جواز میں دلیل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے؟ جبکہ أَمْرُكِ بِيَدِكِ کی صورت میں طلاق بائنہ نہیں ہوگی جیسا کہ آثار سے واضح ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ کی تالیف "جائزة الاحوذی فی التعليقات على سنن الترمذی" حدیث 2/449-451

3 وکیل (وکیل بنانے) کی اجازت؟

ایک تیسری اصطلاح توکیل ہے، یعنی ایک جائز کام کو خود کرنے کے بجائے کسی دوسرے شخص سے کرایا جائے۔شریعت نے اس کو جائز رکھا ہے، اس کو نیابت بھی کہا جاتا ہے۔طلاق دینا بھی (ناگزیر حالات میں) جائز ہے اور یہ صرف خاوند کا حق ہے، تاہم خاوند اپنا یہ حقِ طلاق وکیل کے ذریعے سے استعمال کرے تو دوسرے معاملات کی طرح یہ توکیل بھی جائز ہے۔قرآن کریم کی آیت:

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا سورۃالنساء 35:4

میں جمہور علما کے نزدیک حَکَمین کے توکیل بالفُرقہ ہی کے اختیار کا بیان ہے۔

اسی توکیل میں وہ خاص صورت بھی شامل ہے جو پنچایتی توکیل کی ضرورت پیدا کر دیتی ہے، مثلاً: ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا حتیٰ کہ بیوی بار بار اپنے میکے آجاتی ہے اور خاوند بار بار حسن سلوک کا وعدہ کر کے لے جاتا ہے لیکن وعدے کے مطابق حسن سلوک نہیں کرتا، بالآخر لڑکی کے والدین تنگ آکر اس سے وعدہ لیں کہ اس دفعہ عہد کی پاسداری نہیں کی تو ہم آئندہ اس کو تمہارے پاس نہیں بھیجیں گے، خاوند سے پنچایت میں یہ اقرار لیا جائے۔اس صورت میں یہ پنچایت توکیل بالفرقہ کا کردار ادا کر کے دونوں کے درمیان جدائی کروا دے۔

پنچایت یا عدالت کا یہ فیصلہ طلاق کے قائم مقام ہو جائے گا، جیسے خلع میں عدالت کا فیصلہ فسخ نکاح سمجھا جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی عورت کے اقربا خاوند سے تفویض طلاق کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ تم بیوی کو حق طلاق تفویض کرو، یعنی معاہدۂ حسن سلوک کی پاسداری نہیں کی گئی تو بیوی حق طلاق استعمال کرے گی بلکہ خلع کی طرح پنچایت یا عدالت ہی علیحدگی کا فیصلہ کرے گی۔

خلع اور اس توکیل میں فرق یہ ہے کہ خلع میں حق مہر واپس لینے کا حق خاوند کو حاصل ہے جب کہ پنچایتی فیصلے میں خاوند کو یہ حق نہیں ہوگا کیونکہ یہ جدائی خاوند کے اقرار یا وعدے کی بنیاد پر ہوگی۔دوسرے، توکیل کی وجہ سے یہ جدائی طلاق کے قائم مقام ہوگی۔

4 تفویض طلاق؟

چوتھی اصطلاح، تفویض طلاق ہے جس کی اجازت فقہائے احناف اور دیگر بعض فقہاء دیتے ہیں لیکن

شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزری۔ کیونکہ بیوی کو حق طلاق تفویض کرنے میں ان تمام حکمتوں کی نفی ہے جو حق طلاق کو صرف مرد کے ساتھ خاص کرنے میں مضمر ہیں۔

اس اعتبار سے عورت کو کسی بھی مرحلے میں حق طلاق تفویض نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ابتدا میں عقدِ نکاح کے وقت اور نہ بعد میں عدمِ موافقت کی صورت میں۔ عدم موافقت کی صورت میں چار صورتیں جائز ہوں گی جن کی تفصیل گزری۔ ہم خلاصے کے طور پر اسے دوبارہ مختصراً عرض کرتے ہیں:

1. **تخییر:** نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح خاوند کی طرف سے عورت کو اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ خاوند کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہو تو خاوند اس کو طلاق دے کر اپنے سے علیحدہ کر دے، جیسا کہ ﴿أُمَتِّعكُنَّ وَأُسَرِّحكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا﴾ سے واضح ہے، یعنی طلاق دے کر علیحدگی کا کام مرد ہی کی طرف سے ہوگا۔

2. **توکیل:** یا پھر حَکَمَین (دو ثالثوں) کے ذریعے سے توکیل کا اہتمام کیا جائے گا۔ ایک ثالث خاوند اور ایک بیوی کی طرف سے ہوگا۔ وہ دونوں میاں بیوی کی باتیں آمنے سامنے یا الگ الگ (جو بھی صورت مناسب اور مفید ہوگی) سنیں گے اور اس کی روشنی میں صلح ومفاہمت کی مخلصانہ کوشش کریں گے لیکن اگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو پھر وہ، ان دونوں کے درمیان جدائی کا فیصلہ کر دیں گے۔ یہ فیصلہ بھی طلاق کے قائم مقام ہوگا۔

3. یا أَمرُكِ بِيَدِكِ، کہہ کر خاوند عورت کو علیحدگی کا حق دے دے۔ یہ بھی اختلافات ختم کرنے کی ایک صورت ہے جو آثارِ صحابہ سے ثابت ہے اور یہ طلاقِ کنائی کی ایک شکل ہے۔

4. یا خلع یا پنچایت کے ذریعے سے علیحدگی عمل میں لائی جائے گی۔ خلع کی صورت میں عورت کو حق مہر وغیرہ واپس کرنا پڑے گا۔

ان چار طریقوں کے علاوہ کوئی چوتھا طریقہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہوگا۔

اور یہ تفویض طلاق پانچواں طریقہ ہے جو فقہا کا ایجاد کردہ ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل ہے، نہ صحابہ وتابعین کا کوئی اثر اس کی تائید میں ہے۔

ایک اور عجیب جسارت یا حیلہ

احناف شریعت کے دیے ہوئے اس حق خلع کو نہیں مانتے جو عورت کو مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں دیا گیا ہے، جبکہ عورت کو اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اس لیے احناف نے اس کا متبادل حل ایک تو تفویض طلاق کی صورت میں ایجاد کیا جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ کی، اس کا ایک اور حل حافظ ابن حجر اور امام شافعی نے حنفی ائمہ کے حوالے سے لکھا ہے جو عجیب بھی ہے اور اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں شوخ چشمانہ جسارت بھی۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کا خاوند نہ چھوڑتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ سے تنگ ہو تو وہ خاوند کے بیٹے سے زِنا کروالے، تاکہ وہ خاوند پر حرام ہو جائے کیونکہ فقہ حنفی میں حرام کاری سے بھی رشتۂ مصاہرت قائم ہو جاتا ہے۔[1]

اس حیلے کی بھی ضرورت اسی لیے پیش آئی کہ قرآن و حدیث میں بیان کردہ حق خلع علمائے احناف کو تسلیم نہیں ورنہ اس قسم کی صورتوں میں عورت عدالت سے خلع کے ذریعے سے ناپسندیدہ یا ظالم شوہر سے نجات حاصل کرسکتی ہے۔ هَدَاهُمُ اللهُ تَعَالٰی

ہمارے نزدیک یہ حیلہ بھی بنائے فاسد علیٰ الفاسد ہے۔ حرام کام کے کرنے سے کوئی حلال حرام نہیں ہو سکتا۔ میاں بیوی کا تعلق حلال ہے، بیوی اگر خاوند کے بیٹے سے اپنا منہ کالا کروائے گی تو زنا کاری جیسے جرم کبیرہ کی مرتکب ہوگی لیکن اس سے وہ اپنے میاں کے لیے حرام نہیں ہوگی، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

[لَا يُحَرِّمُ الحرامُ الحلال]

''حرام کام حلال کو حرام نہیں کرے گا۔''

اس لیے اَسلم و اَحوط راستہ عورت کے لیے حق خلع کا تسلیم کرنا ہے، اس حق شرعی کو ماننے کے بعد نہ تفویض طلاق کے کھکھیڑ میں پڑنے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اپنے سوتیلے بیٹے سے منہ کالا کرانے کی۔ اس کے بغیر ہی عورت خاوند سے نجات حاصل کرنا چاہے تو کرسکتی ہے شریعت نے جب کئی معقول طریقے تجویز کیے ہوئے ہیں تو ان کو چھوڑ کر اپنی خود ساختہ غیر معقول تجاویز پر اصرار کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟

---

[1] شرح بخاری، از مولانا داؤد راز دہلوی رحمہ اللہ 266/8، طبع مکتبہ قدوسیہ لاہور۔ فتح الباری، 12/415

کتاب الام، 3/154، طبع ۱۹۷۳ء

ایک ضروری وضاحت، خلع کے بارے میں احناف کا موقف

یہاں کسی کے ذہن میں یہ اشکال آسکتا ہے کہ علمائے احناف تو خلع کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اس کا اثبات بھی، پھر ان کی بابت یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ خلع کا انکار کرتے ہیں؟

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ وہ ظاہری طور پر خلع کا اقرار کرتے ہیں لیکن وہ اس کو اس طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جس طرح شریعت نے یہ حق عورت کو دیا ہے اس لیے ان کا ماننا اقرار کے پردے میں انکار کے مترادف ہے۔ اس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

خلع عورت کا وہ حق ہے جو اسے مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں دیا گیا ہے۔ مرد تو اپنا حق طلاق ایسے موقعوں پر استعمال کر لیتا ہے جب وہ اپنی بیوی سے ناخوش ہو۔ لیکن اگر عورت کو ایسی ضرورت پیش آجائے کہ وہ خاوند سے گلوخلاصی کرانا چاہے، مثلاً: شوہر نامرد ہو، وہ حقوق زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو، یا وہ نان ونفقہ دینے پر قادر نہ ہو یا قادر تو ہو لیکن دیتا نہ ہو، یا کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جس کا علم عورت کو شادی کے بعد ہو، یا وہ سخت ظالم و جابر قسم کا ہو جو عورت پر بے جا ظلم و تشدد کرتا ہو، یا شکل و صورت کے اعتبار سے عورت کے لیے ناقابل برداشت اور اس کا اس کے ساتھ نباہ مشکل ہو۔ اس قسم کی تمام صورتوں میں شریعت نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ شوہر کا دیا ہوا حق مہر اس کو واپس کر کے اس سے طلاق کا مطالبہ کرے اگر شوہر عورت کی خواہش اور مطالبے پر اس کو طلاق دے دے تو ٹھیک ہے، مسئلہ نہایت آسانی سے گھر کے اندر ہی حل ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر مرد مذکورہ معقول وجوہات کے باوجود عورت کی خواہش اور مطالبے کو تسلیم نہ کرے، تو پھر عدالت یا پنچایت کے ذریعے سے اس مسئلے کا حل کیا جائے گا، اگر عدالت اس نتیجے پر پہنچے کہ عورت کا مطالبۂ علیحدگی بالکل جائز ہے تو وہ مرد کو طلاق دینے کا حکم دے گی اگر وہ پھر بھی طلاق نہ دے تو عدالت یا پنچایت فسخ نکاح کا حکم جاری کرے گی جو مرد کے طلاق کے قائم مقام ہو جائے گا اور عورت عدت خلع (ایک حیض) گزارنے کے بعد کسی دوسری جگہ شادی کرنے کی مجاز ہوگی۔

یہ ہے خلع کا وہ طریقہ جو قرآن کریم کی آیت (فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ)[البقرة2:229] اور حدیث میں مذکور واقعۂ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ (پس اگر تم ڈرو....) میں خطاب خاندان کے اولیاء (ذمے داران) معاشرے کے معزز افراد یا حکومت کے افسران مجاز (عدالتی حکام) سے ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والا نزاع، ان کی آپس کی بات چیت سے ختم ہو سکے تو تم مداخلت کر کے اس کو حل کر واور عورت سے فدیہ (حق مہر) لے کر مرد کو دو اور اس سے طلاق دلواؤ، اگر وہ طلاق نہ دے تو تم فسخ نکاح کا آرڈر جاری کر کے ان کے درمیان علیحدگی کر وادو۔

حدیث سے بھی اسی بات کا اثبات ہوتا ہے، حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ خوش شکل نہ تھے جب کہ ان کی بیوی خوبرو تھی۔ انہوں نے بارگاہ رسالت میں آ کر نہایت مناسب الفاظ میں اس بات کو بیان کیا اور کہا کہ میں ثبات بن قیس رضی اللہ عنہ کے دین واخلاق کے بارے میں تو ان کو معتوب نہیں کرتی لیکن ان کے ساتھ رہنے میں مجھے ناشکری کا اندیشہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات سن کر صورت حال کا اندازہ کر لیا اور اس سے پوچھا ''کیا تو ثابت بن قیس کو وہ باغ واپس کرنے پر آمادہ ہے جو اس نے تجھے (حق مہر میں) دیا تھا؟'' اس نے کہا: ہاں! آپ ﷺ نے ثابت بن قیس کو حکم دیا اس سے اپنا باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو چنانچہ انہوں نے طلاق دے دی۔ (یہ واقعہ احادیث کی ساری کتابوں میں موجود ہے)

رسول اللہ ﷺ کا حضرت ثابت کو طلاق کا حکم دینا ایک حاکم کے طور پر تھا اور ظاہر بات ہے کہ خاندانی معاملات ونزاعات میں عدالت یا پنچایت کی مداخلت ناگزیر ہے، اگر عدالت کو یہ حق نہیں دیا جائے گا یا اس کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جائے گا تو پھر ان نزاعات کا حل آخر کس طرح نکالا جائے گا؟

ہم نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ علمائے احناف عورت کے حق خلع کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کے بارے میں ان کا یہ غیر منطقی موقف ہی اس کی بنیاد ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خاوند اگر عورت کے مطالبۂ طلاق کو تسلیم نہیں کرتا تو عدالت کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یکطرفہ طور پر طلاق کی ڈگری جاری کر دے جیسا کہ سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے بعد ہماری عدالتیں اس طرح کے فیصلے کر رہی ہیں۔ علمائے احناف کہتے ہیں کہ عدالتوں کے یہ فیصلے غلط ہیں اور اس طرح عورت کو طلاق نہیں ہوتی۔

حالانکہ عدالت کا یہ حق قرآن کریم کی آیت اور حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے واقعے سے واضح ہے جس کی مختصر تفصیل ابھی گزری۔ اور اس کے بغیر گھریلو نزاعات کا کوئی دوسرا حل ہے ہی نہیں۔ اگر آپ اس منطقی اور فطری طریق کو نہیں مانتے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ آپ شریعت کے عطا کردہ عورت

کے حق خلع کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

آپ ذرا تصور کیجیے! ایک عورت خاوند کے رویّے سے سخت نالاں ہے اور وہ اس سے ہر صورت خلاصی چاہتی ہے، وہ طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، خاوند نے اس کو جو کچھ (حق مہر وغیرہ) دیا ہے، وہ اس کو واپس کرنے کی پیش کش کرتی ہے لیکن وہ کسی صورت طلاق دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اب بتلائیے کہ اگر طلاق خاوند کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوسکتی جیسا کہ علمائے احناف کہتے ہیں تو عورت کو اس کا حق خلع کون دلائے گا؟ آپ کہتے ہیں کہ عدالت مداخلت نہیں کرسکتی اور خاوند کی رضامندی کے بغیر علیحدگی ممکن ہی نہیں ہے تو اس صورت کا حل کیا ہے؟ اور کیا یہ حق خلع کو تسلیم کرنا ہے؟

یہ تو اللہ کے عطا کردہ حق خلع کا صاف انکار ہے، خاوند کی ہٹ دھرمی ہی کا علاج عورت کے حق خلع کی صورت میں بتلایا گیا ہے جو صرف عدالت ہی عورت کو دلواسکتی ہے۔ عدالت کو اگر یہ حق نہیں ہے اور خاوند کسی صورت طلاق دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو عورت کو اس کا یہ حق کس طرح ملے گا جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے؟

حق خلع کے بارے میں علمائے احناف کی تصریحات

اگر کوئی کہے کہ علمائے احناف کا یہ موقف نہیں ہوسکتا جو ان کی طرف منسوب کیا جارہا ہے تو لیجیے انہی کے الفاظ میں ان کا موقف پڑھ لیجیے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب پہلے عنوان قائم کرتے ہیں۔

''کیا خلع عورت کا حق ہے؟''

مولانا موصوف نے اس بحث کا یہ عنوان مقرر کیا ہے۔ اس سوالیہ عنوان ہی سے اس امر کی نشاندہی ہوجاتی ہے کہ ان کے نزدیک عورت کو حق خلع حاصل ہی نہیں ہے پھر فرماتے ہیں:

''ہمارے زمانے میں خلع کے بارے میں ایک مسئلہ عصر حاضر کے متجددین نے پیدا کردیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ خلع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں تراضئ طرفین ضروری ہے اور کوئی فریق دوسرے کو مجبور نہیں کرسکتا۔

لیکن ان متجددین نے یہ دعویٰ کیا کہ خلع عورت کا ایک حق ہے جسے وہ شوہر کی مرضی کے بغیر عدالت سے وصول کرسکتی ہے یہاں تک کہ پاکستان میں کچھ عرصہ پہلے عدالت عالیہ یعنی سپریم کورٹ نے اس کے

مطابق فیصلہ دے دیا اور اب تمام عدالتوں میں اسی فیصلے پر بطور قانون عمل ہو رہا ہے حالانکہ یہ فیصلہ قرآن وسنت کے دلائل اور جمہور کے متفقہ فیصلے کے خلاف ہے۔[1]

تبصرہ

اپنی رائے کو جو تقلیدی جمود پر مبنی ہے، قرآن وسنت کے دلائل اور جمہور کے متفقہ فیصلے کے مطابق قرار دینا یکسر غلط اور خلافِ واقعہ ہے حالانکہ قرآن وسنت کے مطابق خلع کی اصل صورت وہ ہے جس کی مختصر تفصیل ہم نے پیش کی ہے۔ خلع کی اس صورت کو متجددین کی رائے بتلانا اور قرآن وسنت کی نصوص صریحہ کی بے جا تأویل کر کے ان سے اپنے تقلیدی موقف کا اثبات ایک تحکمانہ انداز اور قرآن وحدیث میں بیان کردہ حق خلع کا صریح انکار ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

مضمون طویل ہو گیا ہے ورنہ ہم ان کی ان تأویلاتِ باطلہ کی حقیقت بھی واضح کرتے جو انہوں نے ''درس ترمذی'' میں بیان کر کے تقلیدی جمود کا ثبوت دیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان شاء اللہ ان پر بھی گفتگو ہوگی۔ بعون اللہ وتوفیقہ

ایک اور حنفی مفسیر کا حق خلع کا انکار

تفسیر ''روح القرآن'' کے مفسر آیت خلع کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''خلع میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے، اس میں عدالت یا تیسرا کوئی شخص مشورہ تو دے سکتا ہے، جبر نہیں کرسکتا، نہ عدالت کے پاس ازخود یہ اختیار ہے کہ وہ شوہر کی رضامندی کے بغیر عورت کے حق میں یکطرفہ (ون سائڈ) خلع کا فیصلہ کر دے۔ اگر عدالت ایسا کوئی فیصلہ کرتی ہے تو وہ قرآن وحدیث اور اجماع کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک ناقابل عمل ہوگا اور اللہ کے نزدیک ناقابل قبول رہے گا۔ جس طرح نکاح کی قبولیت کا حق صرف شوہر کو یا اس کے بارے میں مقرر کردہ وکیل ہی کو حاصل ہے اسی طرح خلع کی پیش کش کو قبول کر کے طلاق دینے کا حق شوہر ہی کو حاصل ہے۔ لہٰذا جس طرح بیوی رقم کے بدلے طلاق حاصل کرنے پر راضی ہے اس طرح شوہر کا بھی رقم قبول کر کے طلاق دینے پر راضی ہونا ضروری ہے۔ جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ خلع باہمی رضامندی کے ساتھ جائز ہے۔''

---

[1] درس ترمذی 3/ 497

تبصرہ:

ان صاحب نے بھی حنفی طریق خلع کو قرآن وحدیث کا بیان کردہ خلع قرار دینے کی جسارت کی ہے حالانکہ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حنفی طریق خلع دراصل خلع کا انکار ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس میں دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ اگر خاوند عورت کے مطالبۂ طلاق کو تسلیم نہ کرے تو عورت خلع حاصل کر ہی نہیں سکتی۔ خاوند کی ہٹ دھرمی کا حل قرآن وحدیث میں عدالت کو قرار دیا گیا ہے لیکن حنفی فقہ کہتی ہے، عدالت کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں۔ عدالت اگر مداخلت کرکے عورت کو حق دلائے گی تو عورت کو طلاق نہیں ہوگی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی عورت خاوند کی ہٹ دھرمی کی صورت میں عدالت سے خلع حاصل کرنے کے بعد عدت گزار کے کسی اور جگہ نکاح کرے گی تو یہ نکاح عنداللہ نا قابل قبول ہوگا، جب ایسا ہے تو پھر وہ نئے میاں بیوی تو ساری عمر زنا کاری ہی کے مرتکب رہیں گے۔

بتلایئے! یہ حق خلع کا اثبات ہے جو اللہ کے رسول نے عورت کو دیا ہے یا اس کا صاف انکار ہے۔ خاوند کی رضامندی کے بغیر اگر عورت اپنا یہ حق وصول نہیں کرسکتی، تو پھر خاوند کی ہٹ دھرمی کی صورت میں آخر وہ اپنا یہ حق کیسے وصول کرے گی؟

علمائے احناف آخر اس کی بھی تو وضاحت فرمائیں۔

پھر اس حنفی طریق خلع پر اجماع کا دعویٰ؟ اور چند سطروں کے بعد ہی اسے جمہور فقہاء کا فیصلہ قرار دینا؟ عجیب تضاد فکر ہے۔ اول تو اس کو جمہور فقہاء کا متفقہ فیصلہ بتلانا ہی غلط ہے اگر جمہور کی رائے تسلیم کر بھی لی جائے، تو اجماع تو پھر بھی نہ ہوا۔ اکثریت کی رائے کو اجماع تو نہیں کہا جاتا۔

دراصل اپنی بات کو مؤکد کرنے کے لیے یوں ہی اس کو ''جمہور کی رائے'' کہہ دیا جاتا ہے یا اس پر ''اجماع'' کا دعویٰ کر دیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے امام احمد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے۔ مَنِ ادَّعَی الْإِجماعَ فَهُوَ کَاذِبٌ ''جو کسی مسئلے کی بابت اجماع کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا ہے۔''

زیر بحث مسئلہ بھی اس کی ایک واضح مثال ہے، حنفی طریق خلع نہ جمہور کا متفقہ فیصلہ ہے اور نہ اس پر اجماع ہے۔ بھلا جو مسئلہ (حنفی طریق خلع) قرآن وحدیث کی نصوص صریحہ کے خلاف ہے، اسے جمہور کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟ یا اس پر اجماع کس طرح ہو سکتا ہے؟

صاحب ''روح البیان'' مزید فرماتے ہیں:

''اسلام کی یہ کیسی معتدل تعلیم ہے کہ حتی الوسع نہ کسی کی حق تلفی ہو نہ دل شکنی ہو جیسے باہمی رضا مندی سے عقد نکاح کیا گیا تھا ایسے ہی باہمی رضامندی سے اسے ختم کر دیا جائے، یعنی اگر میاں بیوی کو خطرہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق پورے نہیں کر سکتے تو ایسی صورت میں خلع کی اجازت ہے۔''[1]

سبحان اللہ! کیا خوب فلسفہ تراشی ہے۔ اسلام کی تعلیم میں تو بلاشبہ نہایت اعتدال اور توازن ہے کہ اس نے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے جس کے ذریعے وہ ناپسندیدہ بیوی سے نجات حاصل کر سکتا ہے اور اگر ایسے ہی حالات عورت کو پیش آجائیں اور وہ ناپسندیدہ شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہے تو وہ حق خلع کے ذریعے سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔

یہ تو یقیناً اعتدال اور توازن کی بات ہے جس میں اسلام دیگر ادیان و مذاہب میں ممتاز ہے۔

لیکن جب آپ مرد کو تو مطلقاً یہ حق دے رہے ہیں کہ وہ جب چاہے عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔ کیا طلاق دیتے وقت مرد عورت کی رضا مندی حاصل کرنے کا پابند ہے؟ اور اگر عورت رضا مند نہ ہو تو مرد طلاق نہیں دے سکتا؟ کیا واقعی آپ کے نزدیک ایسا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر یہ کہنا:

''جیسے باہمی رضا مندی سے عقد نکاح کیا گیا تھا ایسے ہی باہمی رضا مندی سے اسے ختم کر دیا جائے۔''

کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

اور اگر اس عبارت کا تعلق صرف عورت کے حق خلع سے ہے کہ اس میں دونوں کی رضا مندی ضروری ہے تو پھر اعتدال تو نہ رہا۔ عورت کے حق طلاق کو تو مقید کر دیا، خاوند کی رضا مندی کے ساتھ، وہ رضا مند نہ ہو تو عورت کے لیے گلوخلاصی کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اس کو کون اعتدال کی تعلیم تسلیم کرے گا جس کو آپ اعتدال باور کرا رہے ہیں۔

اعتدال تو اسلام کے بتلائے ہوئے طریق خلع ہی میں ہے کہ دونوں ہی (مرد اور عورت) کے لیے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ مرد علیحدگی چاہتا ہے تو اس کے پاس طلاق کا حق ہے، عورت علیحدگی چاہتی ہے تو اس کے پاس خلع کا حق ہے، خاوند اگر اس کا یہ حق تسلیم نہ کرے تو عدالت عورت کو اس کا یہ حق دلوائے گی۔ لیکن اگر

---

[1] تفسیر ''روح البیان'' 1/588، جامعۃ البنوریہ العالمیہ، کراچی

آپ مرد کے حق طلاق کے لیے تو رضا مندی ضروری قرار نہیں دیتے لیکن عورت کے خلع کے لیے اس کو ضروری قرار دیتے ہیں تو آپ نے اپنے فقہی جمود کا ثبوت تو یقیناً دے دیا، لیکن خدارا! اس کو اسلام کی تعلیم تو قرار نہ دیں۔ اسلام تو اس عدم اعتدال اور ایک فریق پر ظلم کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس ظلم کو اپنی فقہ کی طرف منسوب کریں، اسلام کی طرف تو منسوب نہ کریں۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی پُر اسرار خاموشی

یہ بات بھی نہایت دلچسپ ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب کے والد گرامی قدر جناب مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے قرآن مجید کی اُردو میں نہایت مفصل تفسیر تحریر فرمائی ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع شدہ ہے، تفسیر ''معارف القرآن'' اس کا نام ہے۔

اس میں ہر اہم مسئلے پر مفتی صاحب موصوف نے خاصی تفصیل سے گفتگو کی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ آیت خلع میں خلع کے بارے میں سرے سے انہوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی بحث نہیں کی بلکہ نہایت پُر اسرار طریقے سے بالکل خاموشی سے گزر گئے ہیں۔

یہ خاموشی کس بات کی غماز ہے؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ اندازہ قرائن وشواہد سے بھی ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ شاید یہی ہو سکتی ہے کہ خلع کی اصل حقیقت جو قرآن وحدیث سے ثابت ہے، وہ حنفی موقف سے متصادم ہے جس کی وضاحت ہم کر آئے ہیں۔ اس کی صراحت ان کے حلقۂ ارادت کے لئے ناقابل قبول ہوتی اور حنفی موقف کے بیان سے ان کے تقلیدی جمود کا اظہار ہوتا۔ اس لئے انہوں نے خاموشی ہی کو بہتر خیال فرمایا۔

اور جب تقلید کے بندھن ڈھیلے ہو جائیں...

تقلیدی جمود کی نیرنگیاں آپ نے ملاحظہ فرمائیں، اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیں اور وہ یہ کہ جب تقلیدی جمود کی عینک اُتر جاتی ہے تو پھر قرآن وحدیث کی واضح تعلیمات اصل صورت میں سامنے آ جاتی ہیں۔ جب یہ بندھن ڈھیلے ہوتے ہیں اور تقلیدی عینک اُتر جاتی ہے تو پھر اعترافِ حقیقت کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

خلع اور تفویض طلاق کا مضمون مکمل کر لینے کے بعد حسن اتفاق سے اس کی دو مثالیں سامنے آئیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ قارئین کرام کو بھی اُن سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ ہماری مذکورہ گزارشات بھی حق الیقین سے بڑھ کر عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیں۔

اُن میں ایک مثال ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج، استاذ الفقہ والتفسیر جامعہ کراچی کی ہے جو غالباً حنفی بریلوی ہیں اور دوسری مثال مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، فاضل دیوبند، صدر مدرّس دار العلوم سبیل السلام (حیدر آباد دکن) کی ہے جو حنفی دیوبندی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کو مسئلہ زیر بحث میں تقلیدی جمود سے نکل کر براہِ راست قرآن وحدیث کی تعلیمات پر غور کرنے کی توفیق عطا فرمائی تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دینا حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی ہے اور عورت کے حقِ خلع کا انکار قرآن وحدیث کی واضح تعلیمات سے انحراف ہے۔

لیجئے! دونوں اَفاضل کے مضامین کی تلخیص ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے ڈاکٹر شکیل اوج صاحب کے مضمون کا ضروری حصہ، جو 'معارف' اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان بھی صاحب مضمون ہی کا تجویز کردہ ہے۔ اس کی تلخیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس میں وہ دلائل بھی تھے جو ہمارے مضمون میں بیان ہو چکے ہیں، اس لئے تکرار سے بچنے کے لئے ان کو حذف کرنا ضروری تھا، اسی طرح بعض مفسرین کے اقتباسات بھی حذف کر دیے گئے ہیں۔ تاہم ان کے اصل دلائل اور اُن کا موقف اگلے صفحات میں ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

(1) تفویضِ طلاق... ایک اہم عائلی مسئلہ

از ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج[1]

میاں بیوی کے مابین قائم ہونے والے رشتہ کو نکاح کہا جاتا ہے اور اس رشتے کے ٹوٹ جانے کو طلاق، نکاح میں دوطرفہ رضامندی ضروری ہوتی ہے مگر طلاق میں دوطرفہ رضامندی ضروری نہیں ہوتی، گو بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ طلاق بھی دوطرفہ رضامندی سے ہی وجود پذیر ہوتی ہے، فقہی اصطلاح میں

---

[1] استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

ایسی طلاق کو 'طلاقِ مبارات' کہتے ہیں۔[2]

شوہر کی طرف سے دی جانے والی طلاق (جو کہ یک طرفہ ہوتی ہے) کو فقط طلاق کہہ دیتے ہیں، بیوی اگر اپنے شوہر سے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور اس کے مطالبہ پر شوہر اگر اسے چھوڑ دے تو ایسی طلاق کو 'خلع' کہتے ہیں۔ اگر خلع کا مطالبہ، عدالت میں دائر کیا جائے جس کے نتیجے میں علاحدگی واقع ہو تو ایسی علیحدگی کو 'فسخ نکاح' کہتے ہیں، مذکورہ صورتوں میں کوئی صورت بھی ایسی نہیں کہ جس میں عورت حق طلاق میں خود مختار نظر آتی ہو۔ عورت کا عدالت میں جا کر طلاق کا مطالبہ کرنا بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت نے اسے طلاق دینے یا اسے اپنے اوپر وارد کرنے کے حق سے محروم رکھا ہے۔ طلاق اسے یا تو اُس کا شوہر دے یا پھر ایمر جنسی کے حالات میں حاکم عدالت اپنے شرعی اختیار سے تفریق کرا دے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عدالت وہ واحد مقام ہے کہ جہاں عورت کو 'حق طلاق' استعمال کرنے کی اجازت دی جاسکتی تھی اور اس مقام پر اس کے برسر عدالت اقدامِ خلع کو طلاق کا بدل قرار دیا جاسکتا تھا مگر شریعت نے انصاف کی جگہ پر (اسلامی عدالت میں) بھی طلاق کا حق بہر حال عورت کو نہیں دیا کیوں کہ "وَلِلرِّجالِ عَلَيهِنَّ دَرَجَةٌ" ''اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے۔'' میں مرد کو ایک گونہ فضیلت برائے ضرورت اسی حق طلاق میں دی گئی ہے، خدا کی طرف سے بخشی گئی یہ 'فضیلت' مردوں کو نہیں، شوہروں کو حاصل ہے اور شوہر چونکہ ایک رشتے کا نام ہے اور رشتے کی فضیلت یہی ہے کہ وہ اس حق کو استعمال کرنے کا مجاز بنایا جائے۔ ہمارے خیال میں اگر کوئی شوہر اپنا یہ حق، اپنی زوجہ کو تفویض کرتا ہے تو دراصل وہ اللہ کی شریعت میں تبدیلی کا جرم کرتا ہے۔ شریعت نے اسے یہ حق ہر گز نہیں دیا کہ وہ اپنا یہ حق زوجہ کو تفویض کر دے اور زوجہ جب چاہے یہ حق استعمال کر کے اپنے خاوند سے الگ ہو جائے، اگر یہ عمل شریعت کی رو سے درست ہوتا تو شریعت طلاق کے عمل کو ہی دو طرفہ کر دیتی، پھر ایسا کرنے کی صورت میں خلع اور فسخ نکاح کی بھی حاجت نہ رہتی اور طلاق بہت آسان ہو جاتی۔

لیکن افسوس کہ ہماری کتبِ فقہ میں تفویض طلاق کے عنوان سے یہ حق، بیویوں کے حق میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تفویض کے بعد طلاق کا حق صرف شوہر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ بیوی کے ہاتھ میں بھی رہتا ہے۔

---

[2] مجموعہ قوانین اسلام: 2/602، از جسٹس تنزیل الرحمٰن، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

اُن دونوں میں سے جو چاہے وہ اسے بغیر کسی رکاوٹ کے استعمال کرسکتا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی طلاق کا ذکر آیا ہے، اس کی نسبت ہمیشہ مرد کی طرف کی گئی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار صرف مرد کو حاصل ہے مگر ہمارے بعض دانشوروں کو یہ امر خداوندی پسند نہ آیا یا یوں کہیے کہ ان کی سمجھ میں نہ آیا، اس لئے وہ اس امر کے مخالف ہو گئے اور اسے عورتوں پر ظلم سے تعبیر کرنے لگے۔[1] ہم سمجھتے ہیں کہ مرد کے حق طلاق پر معترض ہونے یا اس حق کو عورتوں میں منتقل کرنے[2] کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید میں شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے جسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

نکاح کے ذریعے میاں بیوی ایک دوسرے کے زوج قرار پاتے ہیں، اس زوجیت کے رشتے میں مرد ناکح ہوتا ہے اور عورت منکوحہ، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ عورت ناکح ہو اور مرد منکوحہ، اسی لئے تو بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ میں گرہ نکاح کا جس کے ہاتھ میں ہونا بیان ہوا ہے، وہ مرد ہے نہ کہ عورت۔ اس لئے کہ بیدہ میں ''ہ'' ضمیر مذکر کی ہے، اگر ضمیر مؤنث کی ہوتی تو گرہِ نکاح کو عورت کے ہاتھ میں سمجھا جاتا؛ اس طرح عورت ناکح بھی ہوتی اور اس گرہ کو کھولنے کی مجاز بھی مگر شریعت نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نہیں چاہتا کہ گرہِ نکاح عورت کے ہاتھ میں ہو، جب کہ تفویض طلاق میں گرہ نکاح عورت کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور وہ حق طلاق کو خود اپنے ہی خلاف استعمال کر کے اپنے شوہر سے الگ ہوجاتی ہے گویا خود ہی طالقہ ہوتی ہے اور خود ہی مطلقہ بھی، یعنی فاعلہ بھی خود اور مفعولہ بھی خود، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ سے نکاح کرلے، گویا خود ہی ناکح ہو اور خود ہی منکوحہ۔ ذرا سوچئے کہ تفویض طلاق کی صورت حال کس قدر مضحکہ خیز ہے، کوئی ہے جو اس پر غور کرے...؟

'عقدہ نکاح' کی نسبت مرد کے تعلق سے ایک آیت پیشتر بھی مذکور ہے، اپنے موقف کی تائید میں اسے

---

[1] فاضل مقالہ نگار کا اشارہ غلام احمد پرویز جیسے منکرین حدیث کی طرف ہے جو حق طلاق کو صرف مرد کے ساتھ خاص کرنے کو عورت پر ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔[مطالب الفرقان:3/392تا394، طبع طلوعِ اسلام لاہور1993ء][ص-ی]

[2] جیسا کہ علمائے احناف اس کے قائل ہیں۔[ص-ی]

بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ ارشادِ پاک ہے:

﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ أَجَلَهُ...235﴾...سورۃ البقرۃ

''اور معاہدۂ نکاح کو پختہ نہ کرو جب تک بیوہ عورتوں کی عدت مکمل نہ ہولے۔''

تفویض طلاق کی بابت کچھ حقائق منتخب مفسرین کے حوالہ سے بھی ملاحظہ ہوں:

مفتی احمد یار خاں نعیمی رقم طراز ہیں:

''عورتوں کو طلاق کا حق دینا گویا دیوانہ کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے، پھر دن بھر میں پانچ پانچ طلاقیں ہوں گی، دیکھ لو آج امریکہ اور انگلینڈ میں طلاقوں کی کیسی بھرمار ہے کہ وہ لوگ چیخ پڑے ہیں۔''[1]

مزید فرماتے ہیں:

''طلاق کا حق صرف مرد ہی کو ہے، نہ کہ عورت کو''[2] (اس عبارت میں 'صرف' کا لفظ قابل توجہ ہے)

اسلام کا قانون خلع

تفویض طلاق کو سمجھنے کے لئے خلع کے قانون کا سمجھنا بہت ضروری ہے، ہمارے نزدیک خلع کا قانون اپنی فطرت اور اصل میں تفویض طلاق کے قانون کا نقیض ہے۔

علامہ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

''خلع کا فلسفہ یہ ہے کہ خلع عورت کے اختیار میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ مرد کے اختیار میں طلاق ہے، چنانچہ جب عورت کو مرد کی طرف سے کوئی تکلیف ہو تو اس کے اختیار میں خلع ہے اور جب مرد کو عورت کی طرف سے تکلیف ہو تو شارع نے اسے طلاق کا اختیار دیا ہے۔''[3]

---

[1] اشرف التفاسیر المعروف بہ تفسیر نعیمی، جلد 625/4، مکتبہ اسلامیہ، مفتی احمد یار خاں روڈ، گجرات

[2] تفسیر نعیمی: 2/ص 568... تفسیر زیر آیت سورۃ البقرۃ: 237

[3] بدایۃ المجتہد: 68/2، مطبوعہ مصر 1379ھ

سورۃ البقرۃ کی آیت 229 [1]

میں جس صورتِ طلاق کا ذکر ہے، اسے اصطلاحِ شریعت میں خلع کہتے ہیں، طلاق اور خلع میں فرق یہ ہے کہ جب طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہوا ہو اور مرد اس مطالبہ کو پورا کردے تو اسے خلع کہتے ہیں اور رجب مرد محض اپنی خواہش سے عورت کو اپنے سے جدا کرنا چاہے تو اسے طلاق کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا قرآنی آیت کی تفہیم میں جمیلہ بنتِ عبداللہ اور ثابت بن قیس کا واقعہ ہماری رہنمائی کرتا ہے جو صحیح احادیث میں آیا ہے، اس واقعہ میں مذکورہ عورت کی خواہش پر مذکورہ مرد نے رسول اللہ ﷺ کے کہنے پر طلاق دی، خلع کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

اس آیت میں ایک چیز قابل توجہ ہے، آیت کے ابتدائی حصے میں: ﴿وَلا يَحِلُّ لَكُم أَن تَأخُذوا﴾ آیا ہے، اس میں مخاطب کی ضمیر آتی ہے اور مراد شوہر ہیں جبکہ ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ﴾ میں بھی یہی ضمیر آئی ہے مگر اس سے شوہر مراد نہیں ہیں بلکہ حکام عدالت یا بحیثیتِ مجموعی مسلمان مراد ہیں۔نحوی حضرات اپنی اصطلاح میں اسے 'انتشار ضمائر' کہتے ہیں اور اسے جائز و روا رکھتے ہیں، قرآن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔

آیت کو بحیثیتِ مجموعی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں خلع کی دو قسمیں مذکور ہوئی ہیں، قسم اوّل میں اس خلع کا بیان ہے جو گھر کے اندر رہتے ہوئے خوش اُسلوبی سے طے ہو جائے اور قسم ثانی میں اس خلع کا جس کے لئے عورت کو قاضی کی عدالت میں جانا پڑے، بہر دو صورت خلع مطالبۂ طلاق کا نام ہے، خواہ وہ شوہر دے یا حاکم عدالت میں ان میں تفریق کرائے، اسی بات کو مولانا حافظ صلاح الدین یوسف نے اپنی تفسیر احسن البیان میں یوں لکھا ہے کہ

''خلع بذریعہ طلاق بھی ہو سکتا ہے اور بذریعہ فسخ بھی'' [2]

پیر محمد کرم شاہ الازہری نے لکھا ہے:

''عورت حاکم وقت کے پاس خلع کا مطالبہ کرے اور حاکم پہلے اُن کی مصالحت کی کوشش کرے گا، اگر

---

[1] ﴿الطَّلٰقُ مَرَّتانِ فَإِمساكٌ بِمَعروفٍ أَو تَسريحٌ بِإِحسٰنٍ وَلا يَحِلُّ لَكُم أَن تَأخُذوا مِمّا ءاتَيتُموهُنَّ شَيـًٔا إِلّا أَن يَخافا أَلّا يُقيما حُدودَ اللَّهِ فَإِن خِفتُم أَلّا يُقيما حُدودَ اللَّهِ فَلا جُناحَ عَلَيهِما فيمَا افتَدَت بِهِ تِلكَ حُدودُ اللَّهِ فَلا تَعتَدوها وَمَن يَتَعَدَّ حُدودَ اللَّهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمونَ۔ ۲۲۹﴾...سورۃ البقرۃ

[2] تفسیر زیر آیت 229

کامیابی نہ ہوتو خاوند نے عورت کو مہر میں جو کچھ دیا تھا، حاکم اسے لے کر خاوند کو واپس کردے اور اس کے درمیان تفریق کرادے یہ خلع ہے''[1]

خلاصہ کے طور پر عرض ہے کہ طلاق یعنی زوجین کے مابین جدائی کی جو قسمیں قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہیں، ان میں ایک تو طلاق ہے، دوسری خلع اور تیسری فسخ نکاح ہے۔ یہ تینوں قسمیں اپنے حوالوں کے ساتھ اوپر مذکور ہوچکیں اور تینوں کی موجودگی میں تفویض طلاق کا قانون ہماری نظر میں خدائی شریعت میں کسی نقص اور کمی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔

[ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، بھارت، جنوری 2007ء صفحات 23 تا 34 ملخصاً]

اب دوسرا مضمون ملاحظہ فرمائیں، اس میں فاضل مضمون نگار نے حنفی ہونے کے باوجود حق خلع کے انکار کے لئے احناف جو دلائل پیش کرتے ہیں، اُن کا جواب بھی دیا ہے اور اُنہیں نصوصِ قرآن و حدیث کے خلاف قرار دیا ہے۔ اس کا عنوان بھی فاضل مضمون نگار ہی کا تجویز کردہ ہے۔ یہ مضمون اُن کی کتاب 'جدید فقہی مسائل' سے ماخوذ ہے...

خُلع میں قاضی اور حَکَم کے اختیارات

خلع کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس میں قاضی اور عدالت کے اختیارات کیا ہوں گے؟ کیا یہ مکمّل طور پر مرد ہی کے اختیار میں ہے اور اس کی آمادگی اور رضامندی ہی پر طلاق موقوف ہے یا اس میں قاضی کو دخیل ہونے کا بھی کچھ حق ہے؟

فقہا کی رائیں

اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے یہاں یہ اختیار مکمل طور پر مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قاضی خود یا قاضی کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حَکَم بطورِ خود عورت کو طلاق نہیں دے سکتے۔ اس کے برخلاف امام مالک کے نزدیک قاضی زوجین کے حد سے گزرے ہوئے باہمی اختلاف کی صورت میں

---

[1] ضیاء القرآن، جلد اوّل ص 158، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ لاہور، طبع اوّل 1402ھ

ایک دورکنی مصالحتی کمیٹی قائم کرے گا جس میں بہتر ہے کہ ایک مرد کا رشتہ دار ہو اور دوسرا عورت کا، دونوں سمجھدار اور شرعی احکام سے واقف ہوں، پھر وہ ان دونوں کے حالات کا جائزہ لیں۔ اگر مصالحت اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئے تو دونوں میں مصالحت کرا دیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے اور دونوں کی رائے ہو کہ باہم تفریق اور علیحدگی کرا دی جائے تو وہ یہ بھی کر سکتے ہیں؛ اس طرح کہ مرد کا رشتہ دار حکم طلاق دے دے اور عورت کا رشتہ دار حکم مہر معاف کرنے کا یا جو معاوضہ مناسب سمجھے عورت کو اس کی ادائیگی کا پابند کرے اور دونوں میں تفریق ہو جائے۔ (1)

احناف کے دلائل

احناف دراصل اس مسئلہ میں اس عام اُصول پر چلے ہیں کہ طلاق کا اختیار مردوں کے ہاتھ میں ہے اور خلع بھی مال کے عوض میں طلاق ہی ہے، اس لیے مرد کی آمادگی بہرطور ضروری ہوگی۔ اس بنا پر ان کے یہاں حکمین کی حیثیت زوجین کے وکیل کی ہوتی ہے اور وہ اِنہی حدود میں رہ کر اقدام کر سکتے ہیں جو زوجین نے متعین کر دی ہیں۔

دوسرے اُن کا استدلال اس واقعہ سے بھی ہے جسے ابوبکر جصاص رازی نے اپنی 'احکام القرآن' میں اور دوسرے مختلف مصنّفین نے بھی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک ایسے ہی مقدمہ میں حکم متعین کیے۔ پھر ان حکمین سے مخاطب ہو کر ان کی ذمہ داری بتائی کہ اگر ان دونوں کو جمع کر سکو تو جمع کر دو اور ان کا ازدواجی رشتہ برقرار رکھو اور اگر تفریق و علیحدگی مناسب محسوس ہو تو ایک دوسرے کو علیحدہ کر دو۔ عورت تو اس پر آمادہ ہو گئی مگر مرد نے علیحدگی پر اپنی عدمِ آمادگی کا اظہار کیا۔ حضرت علیؓ نے مرد پر دباؤ ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جب تک تم اس عورت کی طرح فیصلہ کی ہر دو صورت پر آمادگی کا اظہار نہ کرو، یہاں سے ہٹ نہیں سکتے۔ [كَذَبْتَ وَاللهِ لَا تَنْفَلِتُ مِنِّي حَتَّى تُقِرَّ كَمَا أَقَرَّ] (2) تو اس سے استدلال یوں ہے کہ یہاں حضرت علیؓ کا مرد کو تفریق کے لیے آمادہ ہونے پر مجبور کرنا بالکل بے معنیٰ ہوگا، اگر حکم کو بطور خود

---

(1) احکام القرآن للجصاص: 2/192؛ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: 5/177

(2) احکام القرآن للجصاص: 2/239

طلاق دینے کا اختیار حاصل ہو اور وہ مرد کی رضا مندی حاصل کرنے کا مکلف نہ ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ کے دلائل

امام مالک رحمہ اللہ اور جو فقہاء قاضی کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حکمین کو تفریق اور علیحدگی کا مجاز گردانتے ہیں، ان کی دلیل سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَإِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَٱبۡعَثُواْ حَكَمٗا مِّنۡ أَهۡلِهِۦ وَحَكَمٗا مِّنۡ أَهۡلِهَآ إِن يُرِيدَآ إِصۡلَٰحٗا يُوَفِّقِ ٱللَّهُ بَيۡنَهُمَآۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرٗا﴾ [۳۵ سورۃ النساء]

''اگر تم کو ان دونوں کے درمیان شدید اختلاف کا اندیشہ ہے تو ایک ایک حکم مرد وعورت کے خاندان سے بھیجو۔ اگر وہ دونوں اصلاحِ حال چاہیں گے تو اللہ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ اللہ تمام باتوں سے باخبر اور واقف ہے۔''

اس آیت میں متعدد قرائن ایسے ہیں جو امام مالک رحمہ اللہ کے موقف کی تائید کرتے ہیں:

❶ اوّل یہ کہ اس آیت کے مخاطب قضاۃ اور حُکام ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ، ضحاک رحمہ اللہ اکثر مفسرین اور خود ابوبکر جصاص رازی کی یہی رائے ہے اور قرآن کے لب ولہجہ سے بھی اسی کی تاکید ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قاضی اور حاکم کی حیثیت واعظ اور محض اخلاقی اپیل کرنے والے ناصح کی نہیں ہے بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ جو لوگ وعظ ونصیحت کی زبان سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں، اُن کے لیے قانون اور اختیارات کی تلوار استعمال کی جائے۔ لہٰذا اگر قاضی کے مقرر کردہ حکمین کو قانونی اختیار حاصل نہ ہو تو قرآن کا قاضی کو مخاطب بنانا اور قاضی ہی کی طرف سے حکمین کی تقرّری ایک بے معنی بات ہو جائے گی۔ اس لیے قضاۃ اور حکام سے خطاب بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس مسئلہ میں قاضی کے نمائندہ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ وہ چاہے تو مصالحت کرا دے یا اپنی صوابدید پر علیحدگی کر دے۔

❷ دوسرے قاضی کے بھیجے ہوئے ان نمائندوں کے لیے قرآن نے حکم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حکم کے معنی خود حکم اور فیصلہ کرنے والے کے ہیں۔ اب اگر اس کی حیثیت محض طرفین کے وکیل کی ہو اور وہ ان کے احکام کا پابند ہو تو وہ حکم اور فیصل کہاں باقی رہا۔ اس تعبیر کا تقاضا بھی ہے کہ وہ تفریق اور مصالحت کے معاملہ

میں خود مختار ہوں۔

❸ تیسرے قرآن نے یہاں ﴿إِن يُرِيدَا إِصلَحًا﴾ کہا ہے: ''اگر حکمین ان دونوں میں مصالحت کرانا چاہیں۔'' یہاں حکمین کی طرف 'ارادہ' اور 'چاہنے' کی نسبت کی گئی ہے اور ایسی بات اسی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو کسی کام کے کرنے اور اس کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جو شخص کسی کا وکیل ہو وہ ارادہ واختیار کا مالک نہیں ہوتا وہ تو بہر صورت خاص اسی حکم کا پابند ہوتا ہے۔

احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اب آیئے ان احادیث کی طرف جو اس مسئلہ میں قاضی کے مختار ہونے کو بتاتی ہے:

❹ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے دین واخلاق سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں ہے کہ مسلمان ہو کر کسی کی ناشکری کروں [أکرہ الکفر في الاسلام] یعنی ایک طرف ثابت رضی اللہ عنہ کا میرے ساتھ اچھا سلوک ہے، دوسری طرف میرا اُن کی طرف طبعی رجحان نہیں ہے جس کے باعث میری طرف سے ان کی ناقدری ہوتی ہے۔ اس لیے ہم دونوں میں علیحدگی کرادی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس کو اس کا باغ لوٹا دوگی۔ اُنہوں نے کہا: 'ہاں'.... اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو (اقبل الحدیقة و طلّقها تطلیقةً) اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم دیا لہٰذا اُنہوں نے بیوی کو علیحدہ کردیا۔ (أمرہ ففارقها)[1]

امام بخاری رحمہ اللہ کی ایک اور روایت اور نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام جمیلہ بنت عبداللہ تھا۔ اس حدیث میں واقعہ کا یہ پہلو بہت قابل غور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے اپیل نہیں کی نہ مشورہ کیا بلکہ دوٹوک لفظوں میں طلاق دینے کا حکم فرمایا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ قاضی مرد کی رضامندی اور آمادگی معلوم کرنے کا پابند نہ ہوگا بلکہ حسبِ ضرورت اس کو اپنی صوابدید پر نافذ کرے گا۔ اب اس کے نافذ کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ خود مرد اس بات کے لیے تیار ہوجائے اور طلاق دے

---

[1] صحیح بخاری: 5273، 5276

دے جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا، یا پھر قاضی خود علیحدہ کر دے۔

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم

احادیث کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہ کے آثار اور معمول پر نظر ڈالیے:

5 اس نوعیت کا ایک واقعہ سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آیا۔ ان کے زمانہ میں عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ عتبہ (جو میاں بیوی تھے) کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحیثیتِ حکم بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (أفرقن بینهما) ''میں ضرور ان دونوں میں تفریق کر دوں گا۔'' اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں عبد مناف کے دو بزرگ خانوادوں میں تفریق نہیں کر سکتا (ما کنت لا فرق بَيْنَ شَيْخَيْنِ مِنْ بَنِي عَبْدِ مَنَاف) یہاں تک کہ ان دونوں نے باہم خود ہی مصالحت کر لی۔[1]

یہاں بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بحیثیتِ حکم فرمانا کہ میں ان دونوں کے درمیان ضرور تفریق کر دوں گا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حَکم بحیثیتِ حکم خود ہی تفریق کے معاملہ میں مختار ہوتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ دونوں ہی حَکم کسی ایک رائے پر متفق ہو جائیں۔

6 اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ وہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا واقعہ ہے جس کا مجمل ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ دارقطنی نے محمد بن سیرین کے واسطہ سے صحیح سند سے اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ ایک شوہر و بیوی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے شوہر و بیوی ہر ایک کے لوگوں میں سے ایک ایک حَکم منتخب کیے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن دونوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تم کو اپنے ذمّہ داری معلوم ہے؟ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ مناسب سمجھو تو دونوں میں علیحدگی کرا دو۔ عورت نے کہا: میں اللہ کی کتاب پر راضی ہوں چاہے اس کا فیصلہ میرے حق میں ہو یا میرے خلاف...!

شوہر نے کہا کہ جہاں تک علیحدگی کی بات ہے تو میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ (أما الفرقة

---

[1] الجامع الاحکام القرآن للقرطبی: 176/5... سورۃ النساء: 35

فلاں) حضرت علیؓ نے کہا: تم نے جھوٹ کہا، تم بھی جب تک اس عورت کی طرح اقرار نہ کرلو، یہاں سے جا نہیں سکتے۔

اس مقدمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکمین سے کہنا کہ کیا تم اپنی ذمہ داری سے واقف ہو، تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ اگر تم چاہو تو علیحدگی کرا دو(هَلْ تَدْرِيَانِ مَا عَلَيْكُمَا؟ عَلَيْكُمَا إِنْ رَأَيْتُمَا أَنْ تُفَرِّقَا فَرَّقْتُمَا)[1] اس بات کی علامت ہے کہ حکمین بحیثیتِ حکم تفریق کا اختیار رکھتے ہیں اور وہ اس کے ذمّہ دار ہیں۔ اگر ان کی حیثیت محض وکیل کی ہوتی تو سوال اس طرح ہوتا کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کس بات کے وکیل بنائے گئے ہو؟ [هل تدريان ما وكلتما] پھر یہ کہ خلع میں اگر ایک طرفہ مرد کی رضامندی ضروری ہوتی اور قاضی کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہ ہوتا تو یہ بات بھی درست نہ ہوتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر طلاق کی آمادگی کے لئے دباؤ ڈالیں، وہ زیادہ سے زیادہ سفارش اور اپیل ہی کر سکتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر واقعہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالک علیہ الصلوۃ والسلام کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور یہی رائے اکثر فقہاء: اوزاعی، اسحاق، شعبی، نخعی، طاؤس، ابوسلمہ، ابراہیم، مجاہد اور امام شافعی کی ہے اور صحابہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک نقل کیا گیا ہے۔

احناف کے دلائل کا تجزیہ

احناف کے دلائل اس مسئلہ میں قابل غور ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ اصل یہ ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہے، تسلیم ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقاصدِ نکاح کی حفاظت اور زوجین کی مصلحتوں کی رعایت کے پیش نظر قاضی بھی بہت سی صورتوں میں تفریق کا مختار بن جاتا ہے۔ یہاں بھی زوجین کے بڑھتے ہوئے شدید اور ناقابل حل اختلاف کو پیش نظر رکھ کر جب قاضی کے نمائندے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ان دونوں میں تفریق اور علیحدگی ہو جانی چاہیے تو مقاصدِ نکاح کی حفاظت اور دونوں کو اللہ کی حدوں پر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ لگام مرد سے لے لی جائے اور قاضی کی طرف سے مقرر شدہ حکم از خود تفریق کر دیں۔

احناف کا یہ استدلال کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شوہر کو اس کا اقرار کرنے پر مجبور کیوں کیا کہ وہ بھی حکم کے

---

[1] الجامع الاحکام القرآن للقرطبی: 5/177... سورۃ النساء: 35

فیصلہ کے مطابق مصالحت اور علیحدگی ہر دو صورت پر آمادہ ہو۔ کیونکہ اگر حکم کو اس کا اختیار ہوگا تو شوہر کا اقرار کرنا اور انکار کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بھی دوٹوک نہیں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ وران کے ہم خیال حضرات کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس حکم کی حیثیت وہی تھی جو نامرد کو طلاق کا حکم دینے کے سلسلے میں ہے۔

یعنی اگر شوہر نامرد ہو اور عورت نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس سے علیحدگی کی حقدار ہے تو قاضی پہلے خود شوہر سے کہے گا کہ وہ عورت کو طلاق دے دے، مرد اگر اس پر آمادہ ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ خود قاضی اس کی طرف سے عورت کو طلاق دے دے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مطالبہ یہاں اسی نوعیت کا تھا کہ اگر شوہر خود طلاق دے دے تو بہتر ہے ورنہ پھر قاضی کے نمائندے حکمین خود اس ناخوشگوار فریضہ کو انجام دیں گے۔

ہمارے زمانے میں جہالت اور احکامِ شرع سے بے خبری اور اس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں ظلم و زیادتی اور اختلافات کی روشنی میں اگر اس مسئلہ میں فقہائے مالکیہ کی رائے قبول کر لی جائے تو شاید مناسب ہو۔

یہ چند سطریں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ علمائے کرام اور اربابِ افتاء اس جزئیہ پر نظر ثانی کریں۔ [واللہ هو المستعان و علیه التّکلان]

ان اُمور کے علاوہ ہمارے فلاسفہ اسلام نے خلع کی جو روح اور حکمت بتائی ہے وہ بھی اس سے مطابقت رکھتی ہے جو امام مالک کا مسلک ہے۔ چنانچہ حافظ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

"خلع عورت کے اختیار میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ مرد کے اختیار میں طلاق ہے۔ چنانچہ جب عورت کو مرد کی طرف سے کوئی تکلیف ہو تو اس کے اختیار میں خلع ہے اور جب مرد کو عورت کی طرف سے تکلیف ہو تو شریعت نے اسے طلاق کا اختیار دیا ہے۔" [1]

جدید فقہی مسائل: حصہ دوم، ص ۹۷ تا ۱۰۷

غفر اللہ لنا و له

وما علینا إلا البلاغ المبین

[1] بداية المجتهد: 2/68

احکام ومسائل

ایک مجلس کی تین طلاقیں

شرعی ادلہ کی روشنی میں

حافظ محمد سلیم [1]

ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاقیں تین شمار ہوتی ہیں یا ایک؟ یہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، اس کو تین شمار کرکے نافذ کرنے والے بھی ہیں۔ اور یہ تینوں ایک ہی کے حکم میں ہیں، اس کے قائلین کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ہے۔

اس حوالے سے کچھ تفصیل ہدیہ قارئین کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض اہل علم مذہبی تعصب میں اس قدر غلو کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس کا ثبوت نہ قرآن میں نہ حدیث میں، نہ آثار صحابہ کرام سے نہ ہی تابعین عظام سے، اور نہ ہی ائمہ کرام سے ہے، بلکہ یہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہم اللہ کے خود تراشیدہ افکار ونظریات میں سے ہے۔ جوانہوں نے امت میں داخل کئے۔ حاشا اللہ

اس قسم کے کلمات جہاں بعض متعصبین کے تعصب کو جو انہیں اہل الحدیث و اہل السنۃ سے

---

[1] مفتی المدینہ اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی

ہے، واضح کرتے ہیں۔ وہاں ان کے کم علم اور بے بصیرت ہونے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ اب ہم اختصاراً وہ دلائل قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور اہل علم کے اقوال سے نقل کرتے ہیں، جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک مجلس کی تین طلاق قرآن کی روشنی میں

ارشاد باری تعالیٰ ہے: [اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ](البقرۃ: 229)

یعنی طلاق رجعی دو بار ہے۔

یعنی طلاق دے کر رجوع کرنے کا اختیار مرد کو دو مرتبہ ہے، اب یا تو اسے دوسری مرتبہ رجوع کرنے کے بعد معروف طریقہ سے اپنے عقد میں رکھو اور اگر بسانا نہیں چاہتے تو اسے تیسری مرتبہ طلاق دے کر اچھے طریقہ سے چھوڑ دو، اس آیت کریمہ میں لفظ ''مرّتان'' قابل غور ہے، جو دونوں طلاقوں کے درمیان وقفہ کو چاہتا ہے، اس کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیت کریمہ [سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ] (التوبہ: 101) یعنی ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دینگے۔ جس کا صاف واضح مفہوم یہی ہے کہ دونوں عذابوں کے درمیان وقفہ ہے ایک مرتبہ دنیا میں تو دوسری مرتبہ آخرت میں۔

اسی طرح ایک ہی وقت کوئی عمل متعدد بار بھی کیا جائے، تو اسے ایک ہی مرتبہ کہا جائے گا، مثلاً اگر کوئی شخص دس لقمے روٹی کے کھائے تو یوں نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دس مرتبہ روٹی کھائی یا پانچ گھونٹ پانی کے پینے پر یوں نہیں کہا جائے گا کہ اس نے پانچ مرتبہ پانی پیا۔ نیز میدان عرفات میں کچھ دیر وقوف کرلینا اصل حج ہے۔ اب اگر کوئی شخص وقوف عرفہ والے دن دس پندرہ بار میدان عرفات میں آنا جانا کرے تو یوں نہیں کہا جائے گا کہ اس شخص نے پندرہ حج کر لئے، کیوں کہ یہ سب ایک مجلس/ وقت کا عمل ہے جو ایک ہی شمار ہوگا۔

مذکورہ آیت کریمہ کے تحت کئی ائمہ تفسیر نے یہی مفہوم ذکر کیا ہے، جیسا کہ احمد بن علی ابو بکر الرازی الجصاص الحنفی (المتوفی: 370ھ) فرماتے ہیں:

''الطَّلاقُ مَرَّتانِ وَذٰلِكَ يَقْتَضِي التَّفْرِيقَ لَا مَحَالَةَ لِأَنَّهُ لَوْ طَلَّقَ اثْنَتَيْنِ مَعًا لَمَا جَازَ أَنْ يُقَالَ طلقها مرتين و كذلك لَوْ دَفَعَ رَجُلٌ إِلَى آخَرَ دِرْهَمَيْنِ لَمْ يَجُزْ أَنْ يُقَالَ أَعْطَاهُ مَرَّتَيْنِ حَتَّى يُفَرِّقَ الدَّفْعَ''

یعنی اس آیت کا تقاضہ یہ ہے کہ لازماً دو طلاقیں الگ الگ ہوں، کیونکہ اگر کسی نے بیک وقت دو اکٹھی طلاقیں دیں تو اس کے لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اس نے دو مرتبہ طلاق دی ہے جس طرح کوئی آدمی دوسرے کو بیک وقت دو درھم دیتا ہے تو اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے دو مرتبہ درھم دیئے ہیں جب تک کہ دونوں الگ الگ نہ دے۔[1]

یہی بات تفسیر البحر المحیط [صفحه نمبر 192-193 جلد 2]، تفسیر کشاف للزمخشری [صفحه نمبر 283 جلد نمبر 1]، تفسیر المظھری مصنفه قاضی ثناء اللہ پانی پتی [صفحه نمبر 300 جلد نمبر 1]، التفسیر الاحمدیه مصنفه ملا جیون [صفحه نمبر 143-144] و دیگر تفاسیر میں بھی موجود ہے۔

اگر ہم مختلف تفاسیر کی روشنی میں مذکورہ آیت (الطلاق مرتان) کا پس منظر زمانہ جاہلیت کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو وہ بھی کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا اور عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو رجوع کر لیتا اور پھر دوبارہ طلاق دے دیتا اور عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیتا، یوں اس کا مقصد نہ بسانا ہوتا اور نہ ہی بسنے دینا ہوتا بلکہ اسے لٹکا کے رکھنا ہوتا تھا قرآن مجید میں عورتوں پر ہونے والے اس ظلم کا سد باب کیا گیا یہ کہہ کر کہ طلاق دیکر رجوع کرنے کا حق دو مرتبہ ہے، اب یا تو اس کو اچھی طرح بسا کر رکھو یا تیسری طلاق دیکر فارغ کر دو، یہ حقیقت بھی بیک بارگی کے بجائے طلاق کے لئے وقفہ ہونے کے معتبر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

اس تفسیری بحث کو ہم امام شوکانی رحمہ اللہ کے ایک جامع تبصرہ پر ختم کرتے ہیں۔

جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

"وَقَدْ اخْتَلَفَ أَهْلُ الْعِلْمِ فِي إِرْسَالِ الثَّلَاثِ دُفْعَةً وَاحِدَةً: هَلْ يَقَعُ ثَلَاثًا، أَوْ وَاحِدَةً فَقَطْ. فَذَهَبَ إِلَى الْأَوَّلِ الجمهُورُ، وَذَهَبَ إِلَى الثَّانِي مَنْ عَدَاهُمْ وَهُوَ الحقُّ. وَقَدْ قَرَّرْتُهُ فِي مُؤَلَّفَاتِي تَقْرِيرًا بَالِغًا، وَأَفْرَدْتُهُ بِرِسَالَةٍ مُسْتَقِلَّةٍ"[2]

یعنی: اہل علم نے تین طلاقوں کو اکٹھا دینے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ تین شمار ہوں گی یا ایک جمہور

---

[1] احکام القرآن، مذکورہ بالا آیت کے تحت

[2] فتح القدیر: 1/415

پہلے مؤقف کی طرف گئے ہیں اور دیگر اہل علم دوسرے مؤقف کی طرف گئے ہیں اور یہی حق ہے۔اور میں نے اس حوالے سے اپنی دیگر کتب میں گفتگو کی ہےاوراس موضوع پر مستقل رسالہ بھی لکھاہے۔

یہ تو وہ حقیقت ہے جو باختصار ہدیہ قارئین کی گئی تاکہ مجلس واحدہ کی تین طلاقوں کے بارے میں غلط پروپیگنڈہ کرنے والے جان لیں کہ اس کا اثبات اللہ کے رسول ﷺ سے لے کر آج تک ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ان شاءاللہ تعالیٰ

جس طرح مفسرین کی ایک جماعت کا مؤقف اختصاراً پیش کیا گیا،اسی طرح صحیح احادیث میں بھی یہ صراحت موجود ہے، جو ہدیہ قارئین کی جاتی ہے:

ایک مجلس کی تین طلاقیں احادیث کی روشنی میں

حدیث نمبر (1)

یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

[كانَ الطَّلَاقُ عَلى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلىَ اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً] (1)

یعنی ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاقیں رسول اللہ ﷺ کے دور میں،سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورخلافت میں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورخلافت میں ابتدائی دوسال تک ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ یہ حدیث ایک اور سند سے اس طرح مروی ہے کہ ابوالصھباء ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں کہ

[أَتَعْلَمُ أَنَّمَا كَانَتِ الثَّلَاثُ تجعَلُ وَاحِدَةً عَلى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلىَ اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَثَلَاثًا مِنْ إِمَارَةِ عُمَرَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: نَعَمْ] (2)

یعنی کیا آپ کو معلوم ہے؟ کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک کے حکم میں ہوتی تھیں۔ نبی ﷺ

---

(1) صحیح مسلم، حدیث نمبر: 1472

(2) صحیح مسلم، ایضاً

کے عہد مبارک میں ابو بکر صدیق کے عہد مبارک میں اور عمر فاروق کے ابتدائی تین سالوں میں ؟

ابن عباس نے جواب دیا جی ہاں۔

اور تیسری روایت کے الفاظ ہیں:

[أَلَمْ يَكُنِ الطَّلَاقُ الثَّلَاثُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ وَاحِدَةً؟ فَقَالَ: قَدْ كَانَ ذَلِكَ، فَلَمَّا كَانَ فِي عَهْدِ عُمَرَ تَتَايَعَ النَّاسُ فِي الطَّلَاقِ، فَأَجَازَهُ عَلَيْهِمْ]

یعنی ابوالصھباء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں نبی اکرم ﷺ اور ابو بکر کے زمانے میں ایک نہیں ہوتی تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہی ہوتا تھا، لیکن جب عمر فاروق کے زمانے میں لوگوں نے کثرت سے اس طرح طلاقیں دینا شروع کر دیں تو انہوں نے ان پر یہ نافذ کر دیں۔

مذکورہ حدیث نبوی ﷺ پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کا رد

بعض حضرات اس صحیح حدیث کو ایک مفروضہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ حدیث محض وہم اور مفروضہ ہے ان کے خیال میں اس حدیث کا راوی ابوالصھباء غیر معروف ہے اور اس حدیث کی بنیاد اسی ابوالصھباء پر ہے۔لہٰذا یہ روایت ابن عباس سے درست نہیں ہے کیونکہ ثقہ راویوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف روایت کی ہے۔اس لئے یہ روایت منکر ہے نیز اگر ابن عباس کا یہ قول صحیح بھی مان لیں تو دوسرے صاحب علم صحابہ کرام کے مقابلہ میں حجت نہیں ہوسکتا۔

رد:

ہم کہتے ہیں کہ اس صحیح حدیث پر مذکورہ اعتراضات کا درست ہونا تو درکنار قابل التفات بھی نہیں ہیں۔

1 یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے۔امام مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے صحیح میں وہی روایت نقل

کی ہے جو ائمہ محدثین کے نزدیک صحیح ہے۔[1]

اس سے ظاہر ہوا کہ امام مسلم رحمہ اللہ کے دور یا ان سے پہلے محدثین میں سے کسی نے بھی اس روایت پر اعتراض نہیں کیا۔

2 ابو الصھباء غیر معروف نہیں بلکہ ثقہ راوی ہے۔

امام ابوزرعہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔

اور امام ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہے۔[2]

3 ابو الصھباء حدیث کے راوی نہیں ہیں، بلکہ وہ تو سائل ہیں۔ راوی تو امام طاؤس ہیں جو بالاتفاق ثقہ ہیں۔

4 یہ کہنا کہ ثقہ راویوں نے اس کے خلاف روایت کی ہے درست نہیں، کیونکہ اس روایت کے خلاف کسی ثقہ راوی سے کوئی روایت نہیں آئی۔

5 یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ذاتی قول نہیں کہ جس میں دیگر صحابہ ان کے معارض اور خلاف ہوں بلکہ یہ تو ایک معاملہ کی وضاحت ہے۔ طلاق ثلاثہ کے معاملہ کو جیسے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں پایا جاتا تھا ویسے ہی بیان کر دیا۔ جبکہ اس کے برعکس کسی صحابی نے یہ بیان نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر صدیق کے زمانہ میں ایک مجلس کی تین طلاقیں تین شمار ہوتی تھیں۔

6 اس روایت پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ اس روایت کے خلاف فتوی دیتے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو ابن عباس اس کے خلاف فتوی کیوں دیتے؟ یہ اعتراض بھی لایعنی ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ راوی اگر اپنی مروی عنہ کے خلاف عمل کرتا ہے یا فتوی

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم

[2] تہذیب التہذیب: 439/4، تقریب: 154

دیتا ہے تو اس کی روایت مقبول ہے نہ کہ اس کا فتوی یا عمل ملاحظہ فرمائیے۔ [1]

لہذا بالفرض جناب ابن عباس رضی اللہ سے اپنی روایت کے خلاف فتوی بھی اگر ہو تو ان کی روایت کو لیا جائے گا فتوی کو نہیں کیونکہ روایت مرفوع کے حکم میں ہے جو کسی غیر معصوم کے عمل نہ کرنے سے متروک نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ ان کا فتوی مذکورہ حدیث کے موافق بھی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (عون المعبود جلد نمبر صفحہ 222)

لہذا یہ تمام اعتراضات کم علمی کا نتیجہ ہیں، جیسا کہ وضاحت کی جا چکی ہے۔

حدیث نمبر 2

[عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ:طَلَّقَ رُكَانَةُ بْنُ عَبْدِ يَزِيدَ أَخُو بَنِي الْمُطَّلِبِ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ، فَحَزِنَ عَلَيْهَا حُزْنًا شَدِيدًا، قَالَ: فَسَأَلَهُ رَسُولُ اللهِ صَلىَ اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " كَيْفَ طَلَّقْتَهَا؟ " قَالَ: طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا، قَالَ: فَقَالَ: "فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ؟ " قَالَ: نَعَمْ قَالَ: " فَإِنَّمَا تِلْكَ وَاحِدَةٌ فَأَرْجِعْهَا إِنْ شِئْتَ" قَالَ: فَرَجَعَهَا] [2]

یعنی : ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں ایک ہی مجلس میں تو وہ اس پر شدید پریشان ہوئے ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کہ تم نے کیسے طلاق دی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے تین طلاقیں دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کیا تم نے ایک ہی مجلس میں یہ تین طلاقیں دیں انہوں نے کہا: ہاں! میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقین دیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک واقع ہوئی ہے اگر تم چاہو تو رجوع کرلو ابن عباس فرماتے ہیں کہ انہوں نے رجوع کرلیا۔

اس روایت کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَهَذَا الحَدِيثُ نَصٌّ فِي

---

[1] الکفایہ صفحہ نمبر 114، حصول المامول صفحہ نمبر 59، دراسات فی الجرح والتعدیل صفحہ نمبر 234

[2] مسند احمد: 2387

المسْألَةِ لَا يقْبَلُ التّأْوِيلَ ''①

یعنی: '' یہ حدیث اس مسئلہ میں نص ہے اور کسی تاویل کو قبول نہیں کرتی ۔''

مزید اس حدیث کی تصحیح مندرجہ ذیل ائمہ حدیث نے فرمائی ہے۔

علامہ احمد شاکر نے بھی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔②

اس حدیث کے حوالے سے دور حاضر کے عظیم محقق علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"هذا الإسناد صححه الإمام أحمد والحاكم والذهبي وحسنه الترمذي في متن آخر تقدم برقم [1921]، وذكرنا هنالك اختلاف العلماء في داود بن الحصين وأنه حجة في غير عكرمة، ولولا ذلك لكان إسناد الحديث لذاته قويا، ولكن لا يمنع من الاعتبار بحديثه والاستشهاد بمتابعته لبعض بني رافع، فلا أقل من أن يكون الحديث حسنا بمجموع الطريقين عن عكرمة، ومال ابن القيم إلى تصحيحه "③

یعنی: اس سند کو امام احمد، حاکم اور ذھبی نے صحیح کہا ہے، اور امام ترمذی نے دوسرے متن میں اس سند کو حسن قرار دیا ہے، وہاں ہم نے اس سند کے ایک راوی داؤد بن حصین کی توثیق و جرح کے حوالے سے اقوال علماء پیش کر دیئے ہیں، کیونکہ داؤد بن حصین عکرمہ سے روایت بیان کرنے میں قابل حجت نہیں۔ اگر یہ علت نہ ہوتی، تو یہ روایت لذاتہ قوی ہو جاتی، لیکن پھر بھی اس روایت کو بعض بنی رافع کی متابعت کی وجہ سے استشہاد اور اعتبار کے طور پر پیش کرنے سے کوئی مانع نہیں۔ لہذا جناب عکرمہ کے طریق سے یہ روایت حسن کے درجہ سے کم نہیں۔ امام ابن قیم بھی اس کی تصحیح کے قائل ہیں۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں یہ روایت جید الاسناد ہے۔[ایضاً]

---

① فتح الباری: 450/9، طبعہ دار السلام ریاض

② مسند احمد بتحقیق احمد شاکر ③ ارواء الغلیل: 2063

مزید اس روایت کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''و یقوی حدیث ابن اسحاق المذکور ما اخرجه مسلم ''[1]

یعنی: صحیح مسلم والی حدیث اس روایت کو قوی بناتی ہے۔

اعتراض

اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس حدیث میں اضطراب ہے۔ کیوں کہ بعض راویوں نے لفظ "بته" استعمال کیا ہے اور بعض نے "طلاق ثلاثه" کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اس اضطراب کی وجہ سے حدیث قابل عمل نہیں رہی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر "بته" کے الفاظ والی روایت حدیث کے معیار صحت پر پوری اترتی، تو اضطراب قابل التفات ہوتا، جبکہ اس روایت کے اکثر راوی محدثین کے نزدیک ضعیف اور مجہول ہیں۔

"بته" والی حدیث کی سند اور راویوں سے متعلق ائمہ کرام کی آراء ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی سند

[حدثنا ابن السرح و ابراهيم بن خالد الكلبى فى آخرين قالوا حدثنا محمد بن ادريس الشافعى حدثنى عمى محمد بن على بن السائب عن نافع بن عجير بن يزيد بن ركانة ان ركانة بن يزيد طلق الىٰ آخر]

دوسری سند

[حدثنا محمد بن يونس النسائى ان عبدالله بن الزبير حدثهم عن محمد بن ادريس حدثنى محمد بن على عن ابن السائب عن نافع بن عجير عن ركانة بن عبد يزيد عن النبى صلى الله عليه وسلم هذا الحديث]

ان دونوں سندوں میں ایک راوی نافع بن عجیر ہے جس کے متعلق ابن قیم فرماتے ہیں:

"هو مجهول لا يعرف حاله البتة"

---

[1] فتح الباری: 450/9

مجہول راوی ہے۔(اس کا حال بالکل معلوم نہیں ہے اور نہیں معلوم کہ یہ کون ہے اور کیسا ہے)

امام احمد بن حنبل امام بخاری ابوعبید اور ابومحمد بن حزم وغیرہ نے اس کو ضعیف کہا ہے، اور وضاحت کی ہے کہ (ان رواته قوم مجاهيل لم تعرف عدالتهم و ضبطهم)[1]

تیسری سند

[حدثنا سليمان بن داؤد حدثنا جرير بن حازم عن الزبير بن سعيد عن عبدالله بن علي يزيد بن ركانة عن ابيه عن جده]

اس سند میں ایک راوی زبیر بن سعید ہے جو کہ ضعیف ہے۔

میزان میں ہے: لیس بشئی (یعنی یہ راوی کچھ بھی نہیں) اور امام نسائی فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے اور تقریب میں ہے۔لین الحدیث

اسی طرح اس سند کا راوی عبداللہ بن علی بھی ضعیف ہے تقریب میں ہے"هو لين الحديث"

و قال العقيلي اسناده مضطرب لا يتابع على حديثه[2]

لہذا ایسی ضعیف روایت کو بنیاد بنانا صحیح نہیں ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اجماع صحابہ

ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی واقع ہوتی ہیں اس حوالے سے یہ اہل علم کی ایک جماعت کا یہی مؤقف ہے، چناچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں :"نقل عَن عَليٍ وبن مَسْعُودٍ وَعَبْدِ الرَّحمنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ مِثْلُهُ نقل ذَلِك بن مُغِيثٍ فِي كِتَابِ الْوَثَائِقِ لَهُ وَعَزَاهُ لمحَمَّدِ بْنِ وَضَّاحٍ وَنَقَلَ الْغَنَوِيُّ ذَلِكَ عَنْ جماعَةٍ مِنْ مَشَايِخِ قُرْطُبَةَ كَمُحَمَّدِ بْنِ تَقِيِّ بْنِ مخلَدٍ وَمحمَّدِ بْنِ عَبْدِ السَّلَامِ الخشَنِيِّ وَغَيْرِهما وَنَقله بن المنْذر عَن أَصحَاب بن عَبَّاسٍ كَعَطَاءٍ وَطَاوُسٍ وَعَمْرِو بْنِ دِينَارٍ"

---

[1] فتاوی ابن تیمیه صفحه نمبر 15 جلد نمبر 33

[2] بحواله تحفة الاحوذی: 42/4

یعنی: سیدنا علی، ابن مسعود، عبدالرحمن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہم اسی طرح محمد بن وضاح، مشائخ قرطبہ میں سے محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبدالسلام الخشنی وغیرہ، اصحاب ابن عباس میں سے عطاء طاؤس، عمرو بن دینار وغیرہ کا یہی مؤقف ہے۔[1]

یہی مؤقف امام شوکانی کا ہے۔ کما مر

نیز یہی مؤقف امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہم اللہ کا ہے۔

بلکہ اہل علم کی مناسب تعداد کے ساتھ ساتھ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس پر اجماع صحابہ تھا۔ کیونکہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی صحابی سے منقول نہ ہونا اس کی واضح دلیل ہے۔ اسی لئے امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " وأما أقوال الصحابة: فيكفي كون ذلك على عهد الصديق، ومعه جميع الصحابة، لم يختلف عليه منهم أحد، ولا حكى في زمانه القولان، حتى قال بعض أهل العلم: إن ذلك إجماع قديم وإنما حدث الخلاف فی زمن عمر رضی الله عنه، واستمر الخلاف فی المسألة إلى وقتنا هذا"[2]

یعنی: (ایک مجلس میں تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں) اس کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثبوت کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ یہ فیصلہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تھا اور سارے صحابہ رضی اللہ عنھم ان کے ساتھ تھے کسی نے اختلاف نہیں کیا نہ کسی سے کوئی دوسرا قول منقول ہے۔

حتیٰ کہ بعض علماء کا تو یہ کہنا ہے کہ یہ پرانا اجماع ہے اور اختلاف بعد میں پیدا ہوا۔ یعنی خلیفہ ثانی کے زمانے میں اور وہ اختلاف اب تک باقی ہے۔

نیز تعلیق المغنی میں ہے

”ھذا حال کل صحابی من عهد الصدیق الی ثلاث سنین من خلافة عمر بن الخطاب وهم یزیدون علی الالف قطعاً “[3]

---

[1] فتح الباری: 450/9، وایضاً فی عمدۃ القاری

[2] اغاثه اللهفان

[3] تعلیق المغنی علی الدار قطنی: 4/47

یعنی: دور صدیق سے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی تین سال تک تمام صحابہ کا یہی حال تھا (یعنی سب کے نزدیک تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں) اوران صحابہ کی تعداد قطعی طور پر ایک ہزار سے زائد ہے۔

ایک مجلس میں تین طلاقوں کو طلاق مغلظہ قرار دینے والوں کے دلائل اوران کی حقیقت

اب ہم ان احادیث کے حوالے سے بھی کچھ باتیں ہدیہ قارئین کرنا چاہتے ہیں، جنہیں پیش کر کے علماء احناف کے مفتیوں کی ایک خاصی تعداد بزعم خود یہ سمجھتی ہے کہ صحیح احادیث میں بھی ایک ہی مجلس/ وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو تین شمار کیا گیا ہے۔

دلیل نمبر ①

كانت عائشة الخثعمية عند الحسن بن علي فلما قتل علي قالت الخلافه قال بقتل علي تظهرين الشماتة اذهبي فأنت طالق يعني ثلاثاً [1]

ترجمہ: سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو ان کی اہلیہ عائشہ خشعمیہ نے انہیں مبارک باد دی۔ اس پر حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا یہ مبارک باد سیدنا علی کی شہادت پر ہے۔ تم اس پر خوشی کا اظہار کر رہی ہو، جاؤ! تمہیں تین طلاقیں ہیں۔ جب ان کی عدت ختم ہوگئی تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے بقیہ مہر اور دس ہزار روپے صدقہ بھیجے جب عائشہ خشعمیہ کو یہ رقم ملی تو کہنے لگیں جدا ہونے والے حبیب سے یہ مال کم ہے، یہ سن کر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا کہ اگر نانا کا یہ فرمان نہ ہوتا کہ ''جس نے اپنی بیوی کو ماہواری کے وقت یا مبہم تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت بغیر نکاح ثانی کہ اس کے لئے حلال نہیں'' تو میں رجوع کر لیتا۔

دلیل کا تجزیہ

اس روایت پر کوئی اور جرح کئے بغیر، ہم اس کی سند پر بحث کرتے ہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی عمرو بن شمر ہے جس کے بارے میں ائمہ حدیث نے سخت جرح کر رکھی ہے۔ مثلاً:

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ''منکر الحدیث'' ہے۔

امام نسائی رحمہ اللہ اسے ''متروک الحدیث'' قرار دیتے ہیں۔

---

① سنن الکبری ج 7 ص 336

ابن حبان اسے رافضی،صحابہ کو برا بھلا کہنے والا اور ثقہ راویوں سے موضوع روایات بیان کرنے والا بیان کرتے ہیں۔

امام یحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں''اس کی حدیث نہیں لکھی جائے گی''۔

جوزجانی کے نزدیک یہ شخص''کذاب''ہے۔①

اس کی ایک اور سند ہے جس میں محمد بن حمید الرازی راوی ہے۔اس کے متعلق بھی ائمہ حدیث نے سخت الفاظ میں جرح کی ہے۔

یعقوب القمی اور ابن مبارک کہتے ہیں یہ''ضعیف''ہے۔

یعقوب بن شیبہ فرماتے ہیں کہ یہ''کثیر المناکیر''ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں''فیہ نظر''۔

ابوزرعہ کہتے ہیں یہ''کذاب''ہے۔

نیز امام فضلک لازی رحمہ اللہ نے کہا میرے پاس اس کی پچاس ہزار حدیثیں ہیں لیکن میں ان میں سے ایک بھی نہیں لیتا۔یہ تو اللہ پر بڑی جرأت کرتا ہے اور لوگوں کی احادیث لے کر الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔

امام خراز تو قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ جھوٹ بولتا ہے۔

صالح جرزہ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ میں بہت ماہر تھا۔②

دوسرا راوی سلمہ بن الفضل الابرش ہے۔

اسحق بن راھویہ کہتے ہیں کہ ضعیف ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں اس کی حدیث میں بعض منکر چیزیں ہیں۔

امام نسائی کہتے ہیں کہ ضعیف ہے۔

امام علی بن المدینی کہتے ہیں ہم نے شہر سے نکلنے سے پہلے اس کی تمام روایات کو پھینک دیا تھا۔

---

① میزان الاعتدال:259/3

② میزان الاعتدال :3/508

ابو حاتم کہتے ہیں قابل صحت نہیں ہے۔ ①

دلیل نمبر ②

"قال سمعت محمود بن لبید قال اخبر رسول اللهﷺعن رجل طلق امراته ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب الله و انا بین اظهر کم حتی قام الرجل و قال یا رسول الله الا اقتله"

ترجمہ: راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے محمود بن لبید سے سنا وہ فرما رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو آپ ﷺ غصہ سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میری موجودگی میں اللہ تعالی کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا میں اسکو قتل نہ کر دوں ②

دلیل کا تجزیہ:

اس حدیث سے ان کے موقف کی بالکل تائید نہیں ہوتی، بلکہ ایسی طلاق پر اللہ کے نبی ﷺ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ کی تین طلاق کو ایک قرار نہیں دیا۔سوال یہ کہ اگر اسے ایک قرار نہیں دیا تو تین قرار دینے کا تذکرہ کہاں ہے؟؟

دلیل نمبر ③

عن سهل بن سعد في هذا الخبر قال فطلقتها ثلاث تطليقات عند رسول اللهﷺ فانفذه رسول اللهﷺ ③

ترجمہ: سیدنا سھل ابن سعد رضی اللہ عنہ سے سیدنا عویمر رضی اللہ عنہ کے قصہ میں منقول ہے کہ سیدنا

---

① میزان الاعتدال: 151/2

② سنن نسائی ج 2 ص 538 ③ سنن ابی داود 1 ص 302

عویمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اکٹھی تین طلاقیں اپنی بیوی کو دے دیں تو آپ نے تینوں طلاقیں نافذ کر دیں۔

دلیل کا تجزیہ

ہر صاحب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ عویمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ لعان کا ہے اور لعان کے احکام طلاق سے بالکل الگ ہیں۔ لعان خود ابدی جدائی ہے اور اس میں طلاق دینا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل شروحات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم یہاں ابن قدامہ رحمہ اللہ کا ایک حوالہ نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

[وَأَمَّا حَدِيثُ المتَلَاعِنَيْنِ فَغَيْرُ لَازِمٍ؛ لِأَنَّ الْفُرْقَةَ لم تَقَعْ بِالطَّلَاقِ، فَإِنَّهَا وَقَعَتْ بِمُجَرَّدِ لِعَانِهِما وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ بِمُجَرَّدِ لِعَانِ الزَّوْجِ] [1]

یعنی: لعان والی حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کیونکہ جدائی طلاق سے نہیں بلکہ مجرد لعان سے ہوئی ہے۔

نیز امام شافعی کا بھی یہی موقف ہے۔ اور ممالک اور ریاستیں جہاں آج بھی ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا ہے اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً سعودی عرب، متحدہ عرب امارات کی تمام ریاستوں میں، مصر، انڈونیشیا اور ملائیشیا وغیرہ میں اسے قانونی حیثیت حاصل ہے۔

طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں ان گزارشات کا مقصد حقائق کو واضح کرنا تھا۔

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه

---

[1] المغنی لابن قدامه

احکام ومسائل

افتاء میں ورع اور احتیاط

ڈاکٹر ابراھیم خلیل عبدالرحیم [1]

دورِ حاضر میں فتویٰ ہمارے قومی اور عالمی میڈیا کا ایک مرکزی موضوع بن چکا ہے، مختلف عناوین پر بات کرنے کے لیے مختلف قسم کے لوگوں کو بُلایا جاتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ انہیں مذہبی اسکالر کے لقب سے نوازا جاتا ہے، اور اپنی چرب زبانی کے زور پر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، فتویٰ کی بنیاد کتاب وسنت نہیں ہوتی بلکہ ان کی چرب زبانی کا کرشمہ ہوتا ہے۔

یہ لوگ محض سستی شہرت کے لئے فتاویٰ کے اصول وقواعد کو بالائے طاق رکھ کر "تتبع الرخص" کے اصول پر چلتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اِفتاء کا منصب بہت اہم اور نازک ہے جو شخص فتویٰ دیتا ہے گویا کہ وہ اللہ اور بندے کے درمیان وسیلہ اور پُل کی حیثیت رکھتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کرتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں اللہ کا حکم یہ ہے، اسی لیے امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب کا نام ہی یہ ہے "إعلام الموقعين عن رب العالمين" اور اُس میں فتاویٰ کے اصول وقواعد کو بہترین انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

افتاء کے منصب کی نزاکت وخطورت کے پیشِ نظر کئی علماء کرام نے فتویٰ کے اصول وقواعد اور آداب پر جامع کتب لکھی ہیں، جن میں امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی کتاب "الفقيه و المتفقه"، حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کی کتاب "آداب المفتي و المستفتي"، ابن حمدان الحنبلی کی کتاب "صفة الفتوىٰ و المفتي و المستفتي"، اور امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب "المجموع شرح المهذب" مقدمہ اس باب میں شہرت کی

[1] Ph:D اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ

حامل ہیں۔

نیز امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی کتاب "جامع بیان العلم و فضله" میں اصولِ فتویٰ سے متعلق کافی بیش بہا مواد موجود ہے۔

ان علماء کرام نے افتاء کے منصب کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس کے اصول وضوابط کو احاطۂ تحریر میں لایا۔

سلف صالحین، علم میں اعلیٰ درجہ رکھنے کے باوصف اصدارِ فتویٰ کے بارے میں حد درجہ محتاط ہوا کرتے تھے۔

فتویٰ میں احتیاط علماء سلف سے چند مثالیں:

صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین فتویٰ دینے میں بہت ہی زیادہ محتاط تھے۔ اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

معاویہ بن ابی عیاش بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں سیدنا عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی مجلس میں موجود تھا اتنے میں محمد بن ایاس بن البکیر آئے اور کہنے لگے: ایک دیہاتی نے اپنی بیوی کو دخول سے قبل تین طلاقیں دی ہیں، اس بارے میں آپ دونوں کی کیا رائے ہے؟ تو عبداللہ بن الزبیر نے فرمایا: ہمیں اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں، تم عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ سے پوچھو، ان دونوں کو میں سیدہ عائشہ کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں، ان سے پوچھ کر ہمیں بھی ان کے جواب سے آگاہ کرنا، محمد بن ایاس البکیر ان دونوں کے پاس آئے اور مسئلہ کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: (أفته يا أباهريرة فقدجاءتک معضلة) اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک پیچیدہ مسئلہ آیا ہے آپ ہی اس کے متعلق فتویٰ دیں، تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: (الواحدة تبينهاوالثلاث تحرمها حتى تنكح زوجاًغيره) پہلی طلاق طلاقِ بائنہ (یعنی وہ طلاق جس میں شوہر کو رجوع کا حق ختم اور عورت کی مرضی سے نیا عقد کی گنجائش ہو) ہوگی، اور تین طلاقیں اس عورت کو حرام کردے گی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے پھر اسے طلاق ہوجائے۔[1]

جلیل القدر تابعی عبدالرحمن بن ابی لیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (أدركت عشرين ومائة من

---

[1] جامع بیان العلم وفضله 2/274۔275۔

أصحاب رسول اللهﷺ مامنهم رجل يسأل عن شيء إلا ودّ أن أخاه كفاه۔۔۔۔۔ يسأل أحدهم عن المسألة فيردها إلىٰ هذا وهذا إلىٰ هذا حتىٰ ترجع إلىٰ الأول)[1]

میں نے ایک سوبیس انصاری صحابہ کو پایا ان میں سے جس سے بھی کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ یہی چاہتا کہ اس بارے میں اس کا جواب اس کا بھائی دے، اور کبھی ان سے کوئی سوال ہوتا تو وہ اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے اور وہ تیسرے کی طرف اشارہ کرتے یہاں تک کہ وہ سوال پہلے ساتھی کی طرف لوٹ آتا۔

مالک بن انس امام دارالهجرة رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مدینہ منورہ میں میری بہت سے علماء، فقہاء سے ملاقات ہوئی ان میں سے کسی سے کوئی دینی مسئلہ پوچھا جاتا تو ان کی حالت ایسی ہوجاتی کہ گویا موت طاری ہوگئی ہے، جبکہ ہمارے زمانے میں لوگ فتویٰ دینے کو پسندیدہ مشغلہ سمجھتے ہیں، اگر ان لوگوں کو روز قیامت کے دن غلط فتویٰ کی سزا کا علم ہوتو وہ کبھی فتویٰ نہ دیں۔

امیر المؤمنین عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ تھا، اور یہ لوگ خیار صحابہ میں سے تھے جب ان سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا جاتا تو وہ اصحاب رسول ﷺ کو جمع کرتے اور ان سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھتے پھر جس بات پر اتفاق ہوجاتا اس کے مطابق فتویٰ صادر کرتے، جبکہ ہمارے دور میں لوگ فتویٰ دینے پر فخر کرتے ہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ امام مالک کی قبر پر رحمتوں کا نزول فرمائے اگر وہ آج ہمارے زمانے کے نام نہاد مذہبی اسکالر کو پردۂ سکرین پر فتویٰ بازی کرتے ہوئے دیکھتے تو ان کے بارے میں کیا فرماتے؟!!!

امام مالک بن انس رحمہ اللہ کے متعلق آتا ہے کہ ان سے ایک دن پچاس مسائل کے بارے میں سوال کیا گیا ان میں سے کسی کا جواب نہیں دیا بلکہ آپ کہا کرتے تھے کہ (من أجاب في مسألة فينبغي قبل الجواب أن يعرض نفسه علىٰ الجنة والنار وكيف خلاصه ثم يجيب) کوئی بھی عالم جواب دینے سے قبل خود کو جنت یا جہنم پر پیش کرے اور یہ سوچے کہ نجات کس طرح ممکن ہے پھر جواب دے۔[3]

---

[1] سنن دارمی: 1/248، حدیث نمبر: 137، جامع بیان العلم وفضله: 2/274

[2] ترتیب المدارک 1/179، [3] آداب المفتی والمستفتی لابن صلاح: 1/79

آپ ہی کے شاگرد الھیثم بن جمیل کہتے ہیں کہ ایک دن امام مالک سے 48 اڑتالیس مسائل کے بارے میں پوچھا گیا ان میں سے (32) بتیس مسائل کے بارے میں فرمایا: لاأدري۔ مجھے اس کے بارے میں علم نہیں۔

جلیل القدر تابعی ابوالمنھال بیان کرتے ہیں کہ میں زید بن ارقم اور البراء بن عازب سے (الصرف) کے بارے میں کسی ایک سے پوچھتا وہ دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ ان سے پوچھو وہ مجھ سے زیادہ دیانتدار اور زیادہ علم والا ہے۔[1]

امام عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں امام مالک کی مجلس میں تھا ایک اجنبی آیا اور کہنے لگا کہ میں چھ ماہ کی طویل مسافت طے کر کے اپنی بستی والوں کی طرف سے بطور نمائندہ ایک مسئلہ آپ سے پوچھنے آیا ہوں، امام مالک نے فرمایا کہ پوچھو، جب اس نے مسئلہ بیان کیا تو امام صاحب نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا کہ مجھے اس کا صحیح علم نہیں، ابن مہدی کہتے ہیں کہ امام صاحب کا جواب سن کر وہ آدمی دنگ رہ گیا اس کا خیال تھا کہ میں تو ایسے شخص کے پاس آیا ہوں جو سب کچھ جانتا ہے، اس نو وارد نے عرض کیا کہ میں اب واپس جا کر اپنی بستی والوں کو کیا جواب دوں گا جنہوں نے محض آپ سے دریافت کرنے کے لیے بہ طور خاص مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنی بستی والوں سے کہنا مالک کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے۔[2]

ابن عون کہتے ہیں کہ ایک دن میں القاسم بن محمد بن ابی بکر کے ساتھ تھا ایک شخص آیا اور کسی مسئلہ کے متعلق ان سے پوچھنے لگا آپ نے جواب میں فرمایا مجھے اس بارے میں مکمل علم نہیں ،تو سائل نے کہا: میں یہاں کسی عالم کو نہیں جانتا آپ ہی اس بارے میں رہنمائی کریں، آپ نے فرمایا تم میری لمبی داڑھی اور میرے اردگرد لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر دھوکے میں مت آؤ، واقعتاً مجھے اس بارے میں علم نہیں ہے، اسی مجلس میں موجود ادھیڑ عمر کے ایک قریشی آدمی نے کہا: اے اجنبی! تم اس مسئلہ کی بابت ان سے

---

[1] جامع بیان العلم و فضلہ: 2/278

[2] جامع بیان العلم و فضلہ: 2/45

جواب کے لیے اصرار کرو میں نے اس مجلس میں تم جیسا ہوشیار نہیں دیکھا ہے، تو القاسم نے فرمایا: (لأن یقطع لسانی أحب إلی من أن أتکلم بما لا علم لی به) میری زبان کا کٹ جانا مجھے زیادہ محبوب ہے اس بات سے کہ میں کسی ایسے سوال کے متعلق جواب دوں جس کا مجھے صحیح علم نہ ہو۔ [1]

فتویٰ میں جرأت مندی اور جلد بازی دکھانے والے سلف کی نظر میں۔

مشہور محدث سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''أجرؤ الناس علی الفتویٰ أقلهم علماً''، فتویٰ دینے میں زیادہ جرأت مند وہ شخص ہوتا ہے جو علمی طور پر نکمّا ہو۔ [2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''إن الذی یفتي الناس فی کل ما یسألونه لمجنون''۔ جو شخص ہر پوچھے جانے والے سوال کا جواب دے وہ پاگل ہے۔ [3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: اے لوگو! جس شخص سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے اسے اس کا علم ہو تو ضرور اس کو بیان کرے، اور جس کو علم نہ ہو تو وہ "اللہ أعلم" کہے، کیونکہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے بارے میں اللہ اعلم کہنا بھی علم ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو یہ کہنے کا حکم دیا ہے:

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (ص:86)

''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں''۔ [4]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: (من فقه الرجل أن یقول لما لا علم له به: اللہ أعلم) [5]

ترجمہ: انسان کی بصیرت اس میں ہے کہ جس کا اسے علم نہ ہو اس میں وہ ''اللہ اعلم'' (یعنی اللہ بہتر جانتا ہے) کہے۔

حبر الأمة سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو شخص کوئی ایسا فتویٰ دیتا ہے جس کا اسے

---

[1] جامع بیان العلم و فضله: 45/2
[2] جامع بیان العلم و فضله: 49/2
[3] جامع بیان العلم و فضله: 276/2
[4] صحیح بخاری، حدیث نمبر: 4809
[5] سنن دارمی، حدیث نمبر: 180،

علم نہیں تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔

اور ابو حصین عثمان بن عاصم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (إن أحدهم ليفتي في المسألة لو وردت على عمر لجمع أهل بدر)[1]

آج کل لوگ ایسے ایسے مسائل میں فتویٰ دینے لگے ہیں اگر یہ مسائل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو درپیش ہوتے تو وہ اہل بدر کو جمع کر کے ان سے ان کا حل معلوم کرتے۔

اور اس کی واضح مثال ہمیں اس واقعہ سے ملتی ہے: جلیل القدر صحابی سیدنا رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھا تھا اتنے میں ایک شخص آپ کی مجلس میں آیا اور پکارا اے امیر المؤمنین! یہ زید بن ثابت مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو غسلِ جنابت کے متعلق اپنی رائے سے فتویٰ دے رہے ہیں، امیر المؤمنین نے فوراً انہیں اپنی مجلس میں حاضر ہونے کا حکم دیا، زید بن ثابت حاضر ہوئے تو امیر المؤمنین ان سے مخاطب ہوئے کہ (أي عدو نفسه قد بلغت أنك تفتي الناس برأيك) اے اپنی ذات کے دشمن! تم لوگوں کو اپنی رائے سے فتوے دے رہے ہو؟! تو زید بن ثابت نے جواباً عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں نے اپنی رائے سے تو فتویٰ نہیں دیا بلکہ میں نے یہ ابو ایوب انصاری، ابی بن کعب، اور رفاعہ بن رافع سے سنا ہے، یہ سن کر امیر المؤمنین، رفاعہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم لوگ جب اپنی بیویوں سے جماع کرتے عدمِ انزال کی صورت میں غسل نہیں کرتے تھے؟ تو رفاعہ گویا ہوئے: ہم اللہ کے نبی ﷺ کے زمانہ میں ایسا کِیا کرتے تھے، ہمیں اللہ کی طرف سے کوئی حرمت نہیں ملی اور نہ ہی اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع کِیا، امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کِیا کہ کیا آپ ﷺ جانتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں؟ تو رفاعہ نے لاعلمی کا اظہار کِیا، تو امیر المؤمنین نے مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور ان سے اس مسئلہ کے بارے میں مشورہ کیا تو ان میں سے بعض نے کہا کہ اس پر غسل واجب نہیں، لیکن معاذ بن جبل اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے ان کے اس جواب سے اختلاف کیا اور فرمایا (إذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل) مرد عورت کی شرمگاہیں آپس میں مل جائیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ اختلاف سن کر امیر المؤمنین نے فرمایا: (هذا وأنتم أصحاب بدر؛ قد اختلفتم فمن بعدكم

---

[1] الآداب الشرعیہ لابن مفلح 65/2،

أشد اختلافاً) تم اصحاب بدر اختلاف کا شکار ہو، تمہارے بعد والے اس سے کہیں زیادہ اختلاف کا شکار ہوں گے، تو حضرت علی بن ابی طالب۔ جو سیدنا عمر کے سُسر اور مشیر خاص تھے۔ نے فرمایا: اس مسئلے میں ازواج مطہرات سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں، آپ ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس کسی کو پوچھنے کے لیے بھیج دیں، جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا (لا علم لی بھا فأرسل إلى عائشة) مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا جائے، جب عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا تو انہوں نے وہی جواب دیا جو معاذ اور علی بن ابی طالب کا جواب تھا: (إذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل)، جب مسئلہ کی وضاحت ہوئی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آج کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ کسی نے ایسا کیا ہے تو میں اس کو سزا دوں گا۔[1]

عہد فاروق میں افتاء کی علمی کمیٹی

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں فتویٰ دینے کے لیے بعض صحابہ کرام کو مخصوص کیا ہوا تھا، اور جن صحابہ کرام کو جس جس علوم پر عبور حاصل تھا صرف اسی کے بارے میں فتویٰ دیتے تھے۔

آپ کا ارشاد ہے: (من أراد أن يسأل عن القرآن فليأت أبي بن كعب، ومن أراد أن يسأل عن الفرائض فليأت زيدبن ثابت، ومن أراد أن يسأل عن الفقه فليأت معاذبن جبل، ومن أراد أن يسأل عن المال فليأتني فإن الله تبارك وتعالىٰ جعلني له خازناً وقاسماً)[2]

اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قانون بنوأمیہ کے دور میں بھی رائج رہا، حج میں فتویٰ کے لئے عطاء بن أبی رباح رحمہ اللہ مقرر تھے۔ امام ذہبی، امام عطاء بن ابی رباح کی حالت زندگی میں لکھتے ہیں: بنوامیہ کے دور میں ایام حج میں یہ اعلان ہوتا تھا کہ (لا يفتي الناس إلا عطاء بن أبى رباح فإن لم يكن عطاء فعبدالله بن نجيح)[3] لوگوں کو فتویٰ صرف عطاء بن ابی رباح دیں گے اگر وہ نہ ہوں

[1] مصنف ابن أبي شيبه، حديث نمبر: 952

[2] كتاب الأموال، ابو عبيد، حديث نمبر: 560، سنن كبرىٰ بيهقى: 210/6،

[3] سير أعلام النبلاء 459/2۔582.

توعبداللہ بن نجیح ۔

اور عباسی عہد میں بھی یہ نظام رہا، جیسے کہ عبداللہ بن وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [سمعت مناديا ينادي بالمدينة ألا لا يفتي الناس إلا مالك بن أنس وابن أبي ذئب] کہ میں نے مدینہ منورہ میں یہ اعلان سنا کہ لوگوں کو فتویٰ صرف مالک بن انس اور ابن ابی ذئب کے سوا کوئی اور نہ دے۔[1]

یہ ہیں سلف صالحین کے چند نمونے جو کمالِ علم کو پہنچنے کے باوجود بہت ہی احتیاط سے فتوے دیتے تھے، اگر ان کو علم نہ ہوتا تو کسی جاننے والے کے حوالہ کرتے، لیکن آج کل ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں لوگ فتوے دینے پر فخر کرتے ہیں، بالکل وہی زمانہ آ گیا ہے جس کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: (اتخذَ النَاس رءوساجهالا فسئلوا، فأَفتَوا بغيرِ عِلم، فضَلوا وَأَضلوا)[2] ترجمہ: لوگ جاہلوں کو سردار بنائیں گے، ان سے سوال ہوگا وہ بغیر علم کے جواب دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اور دوسری حدیث میں آتا ہے (سيأتي على الناس سنوات خداعات يصدق فيها الكاذب ويكذب فيها الصادق ويؤتمن فيها الخائن ويخون فيها الأمين وينطق فيها الرويبضة قيل وماالرويبضة؟ قال: الرجل التافه يتكلم في أمر العامة)[3] لوگوں پر کئی دھوکے والے سال آئیں گے، جن میں جھوٹا شخص سچ بولے گا، اور سچ بولنے والا جھوٹ بولے گا، خیانت کرنے والے امانت دار ہوں گے، اور امین خیانت کرنے لگیں گے، اور رویبضہ عام امور میں باتیں کرنے لگیں گے، کسی نے پوچھا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! رویبضہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: گھٹیا آدمی۔

آج کل ہم انہی مسائل سے دوچار ہیں دین کے معاملہ میں مقاصدِ شرعیہ اور علومِ دین سے نابلد لوگ فتوی دیتے ہیں جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز حلال کو حرام، اور حرام کو حلال قرار دیتے ہیں۔ ناحق کسی کے خون کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ، مسلمانوں کے پاک دھرتی کو دارالکفر، اور کتاب وسنت کی روشنی میں فساد

---

[1] ماروا الأكابر عن مالك بن أنس، صفحہ نمبر: 61

[2] صحيح بخاري، حديث نمبر 100

[3] سنن ابن ماجه، حديث نمبر 4026، شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے: سلسلة الصحيحة، حديث نمبر: 1886

فی الارض اور ابریاء کے ناحق خون کرنے کو حرام کہنے والے کو مرتد قرار دیتے ہیں۔

اور دوسری طرف بعض روشن خیال لوگ شریعت کے بنیادی اصولوں کا ہی انکار کر دیتے ہیں کوئی یہ فتوی دیتا ہے کہ اسلام میں تقسیم میراث میں للذکر مثل حظ الانثیین کا قاعدہ مسلمہ نہیں بلکہ عورت کو مرد کے برابر کا حصہ ملنا چاہیئے، کوئی یہ فتوی دیتا ہے کہ مرد وزن کا اختلاط عین شریعت کے مطابق ہے، کوئی موسیقی کو جائز قرار دیتا ہے۔

الغرض طرح طرح مسائل میں دلائل و حجت کے بغیر اپنے من کے مطابق فتوی دینا آج کل اِن لوگوں کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو غلط فتویٰ کی خطورت کو سمجھتے ہوئے بلا علم فتویٰ کے گناہ سے ڈرتے ہیں، جبکہ جاہل اور بے وقوف لوگ فتویٰ دینے میں نہایت بے باک ہیں۔ اس فانی دنیا میں سستی شہرت کے حصول، اور لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب جمانے کے لیے، یا اپنے مختلف دنیاوی مذموم مقاصد کے حصول کے لیے حرام کو حلال قرار دیتے ہیں۔

امام ربیعہ بن عبدالرحمن الرائ رحمہ اللہ ایک مرتبہ زار وقطار رو رہے تھے کسی نے پوچھا آپ پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے کیوں رو رہے ہو؟ تو آپ نے فرمایا: علم وحکمت سے دُور لوگوں سے فتویٰ پوچھا جا رہا ہے، اسلام میں بہت بڑا سانحہ رونما ہوا ہے۔ آج کل کے بعض مفتی چور اور ڈاکو سے زیادہ زندان کے مستحق ہیں۔ [1]

اس مضمون کے آخر میں امام خطیب اُبو بکر بغدادی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق (کتاب الفقیہ و المتفقہ) کے ایک باب کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے جو اُنہوں نے (باب ذکر شروط مَن یصلح للفتوی) کے نام سے قائم کیا ہے۔

''ایک مفتی کا منصبِ فتویٰ قبول کرنے کے لیے اس کا عاقل، بالغ، عادل ثقہ، اور اُحکامِ شرعیہ کا عالم ہونا نہایت ضروری ہے:

اور اُحکامِ شرعیہ کے اصول چار ہیں:

1 (العلم بکتاب اللہ)، قرآن مجید کے اُحکام، محکم اور متشابہ، عموم وخصوص، مجمل اور مفسر، ناسخ اور منسوخ پر اس کو عبور حاصل ہو۔

---

[1] جامع بیان العلم و فضلہ 355/2.

2 (العلم بسنة رسول الله ﷺ)، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قولی اور فعلی ثابت سنتوں کا علم ہو۔ اُحادیث کے متواتر اور آحاد ہونے، صحیح یا ضعیف ہونے، اور اسکا حکم مطلق ہونے یا کسی سبب کے ساتھ خاص ہونے کا اسے مکمل عبور ہو۔

3 سلف صالحین کے اقوال کے بارے میں اس کو مکمل آگاہی حاصل ہو کہ کس مسئلہ میں سلف کا اُجماع ہے اور کس مسئلہ میں اُن کا اختلاف، تاکہ مجمع علیہ مسائل میں ان کی پیروی کی جاسکے اور مختلف فیہ مسائل میں اجتہاد کیا جاسکے۔

4 قیاس کا صحیح علم رکھتا ہو، تاکہ اُن فروعی مسائل کو جن پر شریعت خاموش ہے، اُن اصولی مسائل پر قیاس کیا جاسکے جن کا شریعت میں واضح حکم ہو، یا اُن مسائل پر قیاس کیا جائے جن پر سلف کا اجماع ہو۔

اِن چیزوں کے علم سے مفتیان کرام (نوازل) نئے نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کر سکتے ہیں، اور اُنہیں حق اور باطل کی پہچان ہوگی۔ اور ایک مفتی کے لیے اِن چیزوں سے لاعلمی کی کوئی گنجائش نہیں''۔ [1]

جبکہ مع الاسف الشدید ہمارے ہاں چار، چھ سال کا ایک کورس کرنے کے بعد مفتی کے لقب سے نواز دیا جاتا ہے، اور احکام شریعہ پر مکمل عبور حاصل کیے بغیر فتوے صادر کرتے ہیں جس سے کہیں خون خرابہ ہوتا ہے، کہیں حرام شرمگاہ کو حلال قرار دیا جاتا ہے، لوگوں کی جان و مال کی حرمت کو پامال کیا جاتا ہے۔

(جیسا کہ آج کل ٹی وی چینلز اور اخبارات میں برطانیہ میں حالیہ دنوں میں پیش آنے والے حلالہ کے بھیانک معاملے پر کافی بحث ہورہی ہے، جوکہ ایک ملعون اور حرام فعل ہے، اور ''نام نہاد شکم پرست مولوی'' کس طرح اس کو ''حلال'' کرنے پر کمربستہ ہیں؟۔ والعیاذ باللہ)

اللھم علمنا ما ینفعنا وانفعنا بما علمتنا وزدنا علما (آمین)

---

[1] الفقیہ و المتفقہ 2/330-331

معیشت واقتصاد

معاشی استحصال کا خاتمہ تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

محمد اصغر شہزاد [1]

تعارف:

آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ ہر مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو کے لئے نمونہ اور راہنما ہے۔ دین حق قیامت تک کے آنے والے لوگوں کے لئے دین اور سیدنا محمد ﷺ کی سیرت طیبہ قیامت تک کے لوگوں کے لئے راہ ہدایت ہے۔ زندگی کا پہلو چاہے معاشی ہو یا معاشرتی دین حق میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ انسان کی فطرت میں قدرت کی طرف سے جو تقاضے رکھے گئے ہیں ان میں سے ایک لازمی اور بنیادی تقاضا معاش یعنی کھانے پینے اور سکونت کا بھی ہے، اس کے بغیر عام حالات میں کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے رب العالمین نے اس دنیا میں قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کی معاش کا وافر انتظام اور وسائل پیدا فرما دیئے ہیں۔ البتہ ان وسائل کی تحصیل اور تقسیم چند شرعی حدود و قیود کے ساتھ انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے"۔

دنیا میں اگر کہیں معاشی ظلم اور نا انصافی نظر آتی ہے تو وہ وسائل معاش میں کمی کے باعث نہیں بلکہ انسانوں کی طرف سے ان وسائل کی غلط اور غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی نو انسان کے لئے راہ ہدایت کا سرچشمہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بنایا اور قانون کے لئے اپنی آخری کتاب قرآن کریم نازل فرمائی۔ اسلام دین فطرت ہے اور اس میں انسان کو ہر نقصان دہ شے سے منع کیا گیا ہے۔

---

[1] PhD Islamic Banking & Finance Scholar
International Islamic University, Islamabad, Pakistan

معیشت جو کہ انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے اس کے بارے میں دین حمید کے اندر مکمل راہنمائی موجود ہے تا کہ عوام الناس کے اندر وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کو روکا جا سکے۔ اس مضمون میں آقا علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی میں جو حکمت عملی رائج تھی اس کا ذکر کیا جائے گا اور موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں بیان کیا جائے گا۔ بنیادی طور پر بنی نو انسان کی معیشت میں جو استحصال کی باعث بننے والی چیزیں آقا علیہ السلام نے منع فرمائیں ان کی دو اقسام ہیں ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی جو کہ بالترتیب پیش کی جائیں گی۔

انفرادی استحصال کا خاتمہ

انفرادی استحصال سے مراد استحصال کی وہ تمام قسمیں ہیں جو کہ ایک فرد واحد سے وابسطہ ہیں اور ایسے معاملے سے ایک فرد واحد نقصان اٹھاتا ہے۔ انفرادی استحصال میں بہت سارے نکات ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

دور جاہلیت میں تجارت کی بہت سی قسمیں تھیں جو کہ بائع یا مشتری میں سے ایک یا دونوں کے استحصال کا باعث بنتیں۔ آپ ﷺ نے ان تمام بیوع کو منع فرمادیا ان بیوع کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بیع منابذہ:

بیع کی اس قسم میں جب فروخت کنندہ (بائع) خریدار (مشتری) کی طرف کپڑا پھینکتا تو بیع لازم ہو جاتی۔ اس قسم کی بیع میں خریدار کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہے کیونکہ ممکن ہے کہ سامان تجارت صحیح نہ ہو، اس میں دھوکا پایا جائے تو ایک عاقل شخص اس سامان کو کیونکر خریدے گا؟ لہذا آقا علیہ السلام نے بیع کی اس قسم کو منع فرمادیا۔

بیع ملامسہ:

جب مشتری سامان تجارت کو چھو لیتا تو بیع لازم ہو جاتی۔ حتیٰ کہ وہ نہ تو مبیع کو کھول سکتا تھا اور نہ الٹ کر دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی تھی کہ آنکھیں بند کر کے تجارتی مال پر ہاتھ لگایا جاتا اور یہ

بات طے کر لی جاتی کہ جس مال پر ہاتھ پڑے وہ اتنی قیمت کا ہوگا۔اس کی موجودہ دور میں عام مثال ملتی ہے کہ اگر ایک گاہک کوئی سامان خریدتا ہے تو دکان پر نمایاں لکھا ہوتا ہے کہ خریدا ہوا مال واپس یا تبدیل نہیں ہوسکتا۔جو کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کی سخت مخالفت ہے۔

بیع حبل الحبلۃ:

بیع کی اس قسم میں مشتری (خریدار) اونٹنی اس وعدہ پر خریدتا کہ جب وہ جنے پھر اس کا جو بچہ ہو وہ جنے تب اسکی قیمت ادا کروں گا۔اب اس بیع میں فروخت کنندہ استحصال کا شکار ہو رہا ہے کیونکہ اگر اس اونٹنی نے مادہ کی جگہ نر جنا تو اس کی قیمت نہ مل سکے گی۔

بیع صفقہ:

دور جاہلیت میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ جب مشتری کوئی چیز خریدتا وہ بائع کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر یہ ثابت کرتا کہ اب بیع مکمل ہوگئی۔اس وجہ سے اس بیع کو بیع صفقہ کہا جاتا۔بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ بائع چاہے نہ چاہے مشتری چالاکی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بیع کر لیتا جو کہ بائع کو مجبوراً قبول کرنا پڑتی تھی۔صفقہ کا معنی تالی بجانا ہے۔[1]

غرر:

غرر ایک ایسا معاملہ ہے جس کا انجام نامعلوم ہو کہ آیا سودے کی تکمیل ہوگی کہ نہیں۔یہ جوئے کی ایک قسم ہے اگر کسی شخص نے مفرور غلام یا بھاگے ہوئے گھوڑے کا سودا کیا تو گویا اس نے خطرے پر مشتمل بیع کی کہ اگر مفرور غلام یا بھاگا ہوا گھوڑا نہیں ملتا تو یہاں پر جھگڑے کا بہت احتمال ہے۔آقا علیہ السلام نے اس بیع کو منع فرمایا ہے۔ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غرر کی بیع اور بیع الحصاۃ سے منع فرمایا''فقہ کی کتب میں اس کی مثالیں ہوا میں اڑتا ہوا پرندا اور پانی میں مچھلی کی بیع سے دی جاتی ہیں۔موجودہ دور میں غرر کی بہت ساری شکلیں پائی جاتی ہیں جیسے کہ روایتی انشورنس۔انشورنس میں ایک آدمی

---

[1] غفاری ڈاکٹر نور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی [کتاب]۔- لاہور: دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور، 1999.

انشورنس کمپنی سے ماہوار قسط کے عوض اپنی زندگی کی انشورنس کرواتا ہے اور یہ عقد انشورنس ایک خاص مدت کا ہوتا ہے جس میں یہ طے کرلیا جاتا ہے کہ اگراس دورانیے میں گاہک کی موت واقعہ ہوگئی تو اس کو دس لاکھ روپے ملیں گے اور اگر موت واقعہ نہ ہوئی تو اس کو آٹھ لاکھ روپے ملیں گے۔اب اس معاملے میں دونوں کو قطعاً علم نہیں کہ آیا گاہک کی موت واقعہ ہوگی کہ نہیں؟ اور گاہک کے لواحقین کو دس لاکھ ملیں گے یا کہ آٹھ لاکھ روپے۔

ناپ تول میں کمی:

دھوکا دہی اور فریب کی بدترین قسم ناپ تول میں کمی ہے جو لوگ اس سنگین جرم کے مرتکب ہیں وہ اسلام کی نگاہ میں قابل نفرت اور سخت سزا کے مستحق ہیں۔قرآن مجید نے اس جرم کی قباحت اور اخروی سزا یوں بیان فرمائی ہے۔ترجمہ:''ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں''(سورۃ المطففین : آیت نمبر 1 تا 3) سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم میں شرک کے علاوہ جو ایک بڑی خرابی تھی وہ یہ کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔حالانکہ یہ لوگ بڑے آسودہ حال تھے۔جب یہ لوگ سیدنا شعیب علیہ السلام کی نصیحت پر بھی باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ برسا کر ان کو مال و دولت سمیت تباہ کردیا۔یہ عذاب اس طرح آیا کہ پہلے سات دن تک ان پر سخت گرمی اور دھوپ مسلط کردی گئی اس کے بعد بادلوں کا ایک سایہ آیا، چونکہ یہ لوگ سات دن کی سخت گرمی سے بلبلائے ہوئے تھے اس لیے سب سائے تلے جمع ہوگئے تکہ ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھائیں۔لیکن چند لمحے بعد ہی آسمان سے آگ کے شعلے برسنا شروع ہوگئے، زمین زلزلے سے لرز اٹھی اور ایک سخت چنگھاڑ نے انہیں ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔[1]

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ترجمہ:''انہوں نے اسے (شعیب علیہ السلام کو) جھٹلایا تو انہیں سائبان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔وہ بڑے بھاری دن

[1] علی حافظ ذوالفقار معیشت و تجارت کے اسلامی احکام [کتاب].- لاہور: ابوہریرۃ اکیڈمی, 2010. ص 55

کا عذاب تھا''(سورۃ الشعراء آیت نمبر 189)

آقا علیہ السلام نے فرمایا:''جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اس پر قحط سالی، سخت محنت اور حکمرانوں کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے''۔ ناپ تول میں کمی ایک بہت قبیح عمل ہے اور اسلام نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔ اس میں خریدار کا سراسر استحصال ہوتا ہے کیونکہ گاہک پیسے پورے دیتا ہے مگر چیز کم ملتی ہے۔ چونکہ ناپ تول میں کمی کرنا ایک شدید ظلم اور استحصال ہے اور اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے اس معاملے میں احتیاط برتنے کے بارے میں آقا علیہ السلام نے امت کی راہنمائی فرمائی کہ:''جب تم تول کر دو تو جھکتا ہوا دو''۔ [1]

مال بیچتے وقت دھوکا دینے کی ممانعت:

دین حنیف قیامت تک کے انسانوں کے لئے راہ ہدایت ہے اور اس میں ہر انسان کا مال اسی طرح محترم ہے جس طرح کہ اس کی جان اور عزت۔ اسلام میں کسی کو دھوکہ دینے کی سخت ممانعت ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلے کے ایک ڈھیر پر گزر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں ہاتھ ڈالا تو انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے غلے والے! یہ کیا؟ وہ کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بارش ہوگئی تھی، آپ نے فرمایا: تو تو نے اسے (نم دار غلے کو) ڈھیر کے اوپر کیوں نہ کر دیا تاکہ لوگ دیکھ سکیں، پھر فرمایا:''جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں''۔ [2] اس حدیث مبارکہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آقا علیہ السلام نے کتنی سختی کے ساتھ دھوکا دینے والے کی مذمت کی ہے۔ دوسری طرف آقا علیہ السلام نے مال بیچتے وقت مال میں نقص بتانے کی ترغیب بھی دی ہے۔

حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کوئی چیز فروخت کرے تاوقتیکہ اس کے اندر جو خوبی یا خرابی ہے اسے بیان نہ کر دے''۔ اسی طرح اگر فروخت کنندہ کے علاوہ کسی شخص کو اس کا علم ہو گیا ہے تو وہ دوسروں کو اس کے متعلق صاف صاف بتا دے۔ [3]

---

[1] سنن ابن ماجہ: باب الرجحان فی الوزن

[2] صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب: قول النبی ﷺ من غشنا فلیس منا. 102.

[3] منصوری، ڈ. م. [2005]. احکام بیع. اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد. ص۔ 103

جانوروں کی خرید وفروخت میں بھی دھوکے کا بہت احتمال ہوتا ہے۔حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ آقا علیہ السلام نے فرمایا:''اونٹنی اور بکری کا دودھ نہ روکو، اگر ایسی حالت میں کسی نے کوئی جانور خرید لیا تو اسے دو باتوں کا اختیار ہے کہ دودھ دوہ کر پسند آئے تو رکھ لے، ورنہ واپس کردے اور اس کے ساتھ ایک صاع کھجوریں بھی دے دے''۔آقا علیہ السلام نے دوھوکا دے کر مال فروخت کرنے کی جس طرح ممانعت فرمائی ہے اسی طرح بعض اوقات لوگ خراب مال کو بیچنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں تا کہ ان کا مال زیادہ قیمت میں فروخت ہو جائے۔اس کی موجودہ دور میں بہت مثالیں ملتی ہیں کہ فروخت کندہ کم قیمت پر چیز خریدتا ہے اور بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں اٹھاتا ہے''۔حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''تین افراد ایسے ہیں جن کی طرف قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ نہ تو نظر(کرم) کریں گے نہ انہیں پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔، ایک وہ شخص جو رہ گزر پر زائد پانی کا مالک ہے اور مسافروں کو نہیں دیتا اور دوسرا وہ شخص جو کسی امام کی بیعت دنیا کی غرض سے کرتا ہے۔اگر وہ اس کی مرضی کے مطابق (اس کو دنیوی مفادات) دیتا ہے تو اس سے راضی وخوش رہتا ہے اور اگر نہیں دیتا تو اس سے ناراض ہوتا ہے۔تیسرا وہ شخص جس نے کسی شخص کے ساتھ عصر کے بعد سودا کیا اور اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ مجھے اس چیز کا اتنا اور اتنا دیا گیا ہے تو دوسرے نے اس کی تصدیق کی''۔[1]

اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ ایک آدمی بازار سے کپڑا خریدنے جاتا ہے اور فرخت کنندہ اسے کہتا ہے کہ اللہ کی قسم مجھے یہ کپڑا پانچ سو میں پڑا ہے اور میرا اس میں پچاس روپے منافع ہے حالانکہ اس نے وہ کپڑا تین سو روپے میں خریدا ہے۔تو یہ بھی ایک استحصال کی قسم ہے جس کو آقا علیہ السلام نے سختی سے منع فرمایا ہے اور اس طرح دھوکا دے کر مال فروخت کرنے والے کے خلاف سخت وعید سنائی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری۔کتاب المساقاۃ۔باب:اثم من منع ابن السبیل من الماء8532۔

.Islamic law of Contracts and Business Transactions.[2009]. M. D,Mansoori

Islamabad, International Islamic University, Shari'ah Academy:Islamabad

تناجش :

نجش ''جھوٹی بولی دینا''۔ یہ بھی دھوکے کی ایک قسم ہے کہ کوئی شخص جو کہ فروخت کنندہ نہیں ہے اور نہ ہی خریدار ہے وہ خریدار کے مقابلے میں مبیع (فروخت کی جانے والی چیز) کی بولی لگائے حالانکہ اس کا ارادہ مال خریدنے کا نہ ہو۔ اور اس کے بولی لگانے کی وجہ سے مبیع کی قیمت بہت اوپر چلی جائے۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! وہ لوگ جو اپنا سامان تجارت اور مویشی بیچنے کی غرض سے منڈی میں لاتے ہیں تو (منڈی سے باہر) ان سے سودا مت کرو۔ اگر ایک آدمی سودا کر رہا ہے تو محض قیمت بڑھانے کے لیے بولی مت لگاؤ۔

انفرادی استحصال کا حل اور تجارت میں فروخت کنندہ اور خریدار کے اختیارات

تجارت جو کہ معیشت میں بڑی اہمیت کی حامل ہے قرآن کریم میں تجارت کے بارے میں متعدد حوالہ جات موجود ہیں جو کہ تجارت کی اہمیت اور اس سے متعلق احکامات پر مبنی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالی تجارت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ، ترجمہ: ''اللہ تبارک وتعالٰی نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام''۔ سورۃ النساء میں ہے، ترجمہ: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی سودا تمہاری باہمی رضامندی کا ہو۔ (سورہ نساء آیت نمبر 29)

اس آیت مقدسہ میں مال ناحق کی ممانعت اور تجارت وغیرہ کی اجازت دی گئی ہے۔ اور حدیث پاک میں ہے: ''مسلمان کا مال دوسرے کیلئے اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔''

بہر حال تجارت اعلی اور بابرکت پیشہ ہے، اس سے حاصل ہونے والی کمائی حلال وطیب ہے۔ بلکہ ایک حدیث مبارکہ میں ہے ''رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت سے حاصل ہوتے ہیں اور ایک حصہ دوسرے پیشوں سے''۔ جبکہ احادیث صحیحہ میں مومن تاجر کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''سچا، امانت دار، مسلمان تاجر بروز قیامت انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''۔ تجارت کی اس اہمیت اور فضیلت کے تحت اسلام نے اس کے بارے میں اصول وقواعد وضع فرما دیئے۔ تجارت میں بائع اور مشتری دونوں کے حقوق کا استحصال ہونے سے بچانے کے لئے خیار البیع کا بے نظیر اصول وضع فرمایا تا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نقصان نہ ہو اور جھگڑے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ

رہے۔موجودہ دور میں ہم بازار میں دوکانوں پر لکھا ہوا دیکھتے ہیں کہ ''خریدا ہو مال واپس یا تبدیل نہیں ہوگا'' یہ سراسر شریعت کے خلاف ہے۔ذیل میں خریدار اور فرخت کندہ کے اختیار جو کہ شریعت نے دیئے ہیں وہ ذکر کئے جاتے ہیں۔

خیار رؤیت

خیار رویت سے مراد یہ ہے کہ خریدار مبیع (چیز) کو خریدتے وقت اس کو اچھی طرح سے جانچ لے اور اس کو دیکھ کر خریدے۔اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز خریدی جو اس نے خریدتے وقت نہیں دیکھی تھی تو وہ دیکھتے ہی یہ اختیار رکھتا ہے کہ چاہے تو پوری قیمت دے کر چیز کو خرید لے یا واپس کر دے۔اگر خریدار مبیع کو دیکھنے سے پہلے کہہ دے کہ میں سودے پر راضی ہوں، پھر وہ مبیع کو دیکھے، تب بھی اسے سودا منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، کیونکہ شریعت نے جو اختیار دیا ہے وہ دیکھنے پر موقوف ہے۔[1] اس اصول کے تحت خریدار کو چیز واپس کرنے کا حق حاصل ہے تاوقتیکہ اس نے اس چیز کو استعمال نہ کیا ہو اور نہ کوئی نقص پیدا ہوا ہو۔

خیار العیب

خیار العیب سے مراد ایسا خیار ہے کہ اگر چیز میں کوئی عیب ہو تو خریدار واپس کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔
آقا علیہ السلام نے فرمایا: ''مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو کوئی چیز اس طور پر بیچے کہ اس کے عیب اور خرابی سے اسے آگاہ نہ کرے''۔جناب حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت ہے آقا علیہ السلام نے فرمایا کہ ''خرید و فروخت کرنے والے فریقین کو اس وقت تک (بیع کو فسخ کرنے کا) اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہو جائیں۔اگر اس سودے میں انہوں نے سچ بولا اور ہر چیز کھول کر بیان کر دی تو ان کے سودے میں برکت ہوگی، اور اگر انہوں نے غلط بیانی کی اور جو بات ظاہر کرنا چاہیے تھی، اسے چھپایا تو اس سودے سے برکت اٹھ جائے گی''۔[2]
نیز آقا علیہ السلام نے فرمایا جس نے دھوکا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔لہذا فروخت کنندہ کے لئے لازم

---

[1] منصوری،ڈ.م.[2005].احکام بیع.اسلام آباد:ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔اسلام آباد.ص۔119

[2] [متفق علیہ]

ہے کہ وہ جو چیز بیچے اگر اس میں کوئی خامی یا خرابی ہو تو اس کے بارے میں خریدار کو مطلع کرے اور اگر ایسا نہیں کرتا تو وہ گنہگار ہوگا۔

خیار المجلس:

خیار کی اس قسم میں خریدار اور فروخت کنندہ جب تک (مقام بیع) بازار میں موجود ہیں تو دونوں کو بیع کا معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ آقا علیہ السلام نے فرمایا: ''بائع (فروخت کندہ) اور مشتری (خریدار) میں سے ہر ایک کو اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں''۔ [1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے بیع میں خیار مجلس فریقین کے فائدے اور رضامندی جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیع کے لیے ایک شرط کے طور پر بیان کی ہے کے لیے رکھا ہے کیونکہ عموماً بیع جلد بازی میں غور وفکر کے بغیر ہی ہوجاتی ہے لہذا یہ شریعت کاملہ کی خوبیوں میں سے ہے کہ اس نے ایک حد (جب تک دونوں فریق بیع کی جگہ موجود ہیں) مقرر کر دی ہے جس میں دونوں فریق اپنے فیصلے پر غور وفکر اور نظر ثانی کر لیں۔ اور اگر خریدار اس مبیع (خریدی ہوئی چیز) میں سے استعمال کر لے تو یہ اختیار ختم ہوجاتا ہے۔ [2]

خیار الشرط

اگر فریقین بائع (فروخت کندہ) مشتری (خریدار) ایک مدت تک کی شرط رکھ لیتے ہیں کہ مجھے اتنی مدت تک سودا منسوخ کرنے کا اختیار ہوگا اور دوسرا فریق بھی اس پر راضی ہو تو اس کو خیار شرط کہتے ہیں۔
آقا علیہ السلام نے فرمایا ''مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں'' [3]

اجتماعی استحصال کا خاتمہ

اجتماعی استحصال سے مراد استحصال کی وہ تمام قسمیں ہیں جو کہ صرف فرد واحد سے وابستہ نہیں بلکہ اس

---

[1] صیحح بخاری: کتاب البیوع: باب کم یجوز الخیار

[2] علی حافظ ذوالفقار معیشت و تجارت کے اسلامی احکام [کتاب]۔- لاہور: ابوہریرۃ اکیڈمی, 2010. ص 87

[3] صحیح بخاری: باب اذا کان البائع بالخیار ھل یجوز البیع

کے نقصانات سے پورا معاشرہ متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔ اور ایسے معاملے سے ہر ایک فرد نقصان اٹھاتا ہے۔اجتماعی استحصال میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

ذخیرہ اندوزی:

ذخیرہ اندوزی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص شہر سے غلہ خریدے اور پھر اسے فروخت نہ کرئے اور اس کی وجہ سے عوام الناس کو مشکل کا سامنہ کرنا پڑے۔اس کو ہم موجودہ دور کی ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک آدمی ایک شہر سے غلہ خریدتا ہے اور اسے اپنے قصبے میں لے جاتا ہے اور اس کو فروخت نہیں کرتا تو یہ آدمی ذخیرہ اندوز کہلائے گا۔لیکن اگر جس جگہ پر غلہ لے کے جا رہا ہے وہ ایک بڑا شہر ہے اور عوام کو اس کے غلہ ذخیرہ کرنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تو وہ شرعاً ذخیرہ اندوز نہیں کہلائے گا۔امام ابو یوسف ؒ نے اس کو ذخیرہ اندوزی میں ہی شمار کیا ہے کیونکہ اس عمل سے عوام الناس کو نقصان پہنچتا ہے۔لیکن امام ابوحنیفہؒ دوسری طرف آقا علیہ السلام کی حدیث مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ''غلہ دور سے اٹھا کر لانے والے کو رزق ملتا ہے'' امام ابو یوسف کے نزدیک ذخیرہ اندوزی ہر اس چیز میں ثابت ہوتی ہے جس کی عدم دستیابی سے عوام الناس کو تنگی اور پریشانی ہوتی ہو، خواہ وہ خوراک ہو یا کوئی اور چیز۔[1] آقا علیہ السلام نے فرمایا ''جس شخص نے چالیس دن تک کھنے پینے کی اشیاء روک رکھیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے'' لہذا اس حدیث مبارکہ میں انتہائی سخت وعید ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک حرام عمل کے لئے ہی ہوسکتی ہے۔ یہ ایک استحصال کی صورت ہے اور اسلام نے اس کی سختی سے مذمت کی ہے۔

سود:

رقم دے کر اس کے عوض اصل سے زائد رقم مقرر کر کے وصول کرنا، یا دو ایسی چیزیں جو ہم جنس ہوں اور وزن یا کیل کی جاتی ہوں کے لین دین میں کمی یا اضافہ کرنا یا ادھار کرنا ''ربا'' یعنی سود ہے۔قرآن وسنت

---

[1] منصوری، ڈ.م.[2005].احکام بیع.اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔اسلام آباد.ص۔103

میں سود کو بہت بڑا گناہ اور اسے سخت ممنوع قرار دیا گیا ہے، بلکہ قرآن مجید میں سود خوروں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ کے ساتھ جنگ کا چیلنج کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود کا حساب و کتاب لکھنے والے اور سودی کاروبار میں گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے ایک حدیث پاک میں ہے کہ شب معراج رسول اللہ ﷺ نے سود خوروں کو جہنم میں اس حال میں دیکھا کہ ان کے پیٹ بڑی بڑی کوٹھڑیوں کی طرح ہیں اور یہ لوگ جہنم میں پتھر اور تھوہر کے کانٹے کھا رہے ہیں۔حرمت ربا کے بارے میں جو آیت کریمہ اور احادیث پیش کی گئی ہیں ان سے ہر ذی شعور اندازہ لگا سکتا ہے سود جیسی لعنت شریعت محمدی ﷺ میں کتنی سختی سے منع ہے۔ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے اپنی کتاب ''اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری'' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ: آقا علیہ السلام، خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اہل ذمہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کے ساتھ معاہدے کیے جن کے بموجب ان کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی ریاست میں آزادانہ اور باعزت زندگی گزار سکیں حتیٰ کہ ان کو اسلامی ریاست کے اندر رہتے ہوئے شراب نوشی اور خنزیر خوری جیسے امور کی بھی اجازت دی گئی جو شریعت کی رو سے قطعا حرام ہیں لیکن ان تمام آزادیوں کے باوجود ان کو سود خوری کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی۔خود رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صراحت کی گئی کہ سودی کاروبار کی صورت میں یہ معاہدہ کالعدم متصور ہوگا۔

یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث مبارکہ میں سود کی واضح حرمت بیان ہوئی ہے مگر اس حقیقت سے بہت سے لوگ واقف نہیں ہیں کہ سود کی حرمت ان بنیادی احکامات میں سے ہے جن کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ انسان کو دین حنیف سے خارج کر دیتا ہے۔سود نہ صرف اسلام بلکہ دوسرے آسمانی مذاہب میں بھی حرام ہے۔سود جو کہ معاشرے کا ایک ناسور ہے اور اس کی وجہ سے اس وقت دنیا میں افراط زر، مہنگائی اور تجارتی خسارے ہیں۔سود چاہے قبل از اسلام کا ہو، ساہوکاری، یا ہندو بنیے کا یہ تمام معاشی استحصال کا موجب ہیں۔اس میں سرمایہ کا بہاؤ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے اور گردش دولت چند ہاتھوں میں رہتی ہے۔اسلام نے ہر طرح کے سود سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔

خلاصہ کلام:

آج امت مسلمہ متعدد مسائل کا شکار ہے اور ان مسائل میں معیشت بنیادی مسئلہ ہے جو کہ ریڑھ کی ہڈی کی حثیت رکھتی ہے۔ ان مسائل کا حل صرف اور صرف قرآن کریم اور آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ سے ہی ممکن ہے۔ ایک تاجر اگر ان اصولوں کو اپنائے تو اس کی روزی میں برکت ہوگی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اجر کا مستحق ہوگا۔ اور ان اصولوں کے انحراف کی شکل میں روز قیامت جوابدہ بھی ہوگا اور سزا کا مستحق بھی۔ اس لئے یہ نہ صرف ایک فرد واحد بلکہ حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ان قوانین کو ریاست میں لاگو کرے اور ان پر سختی سے عمل کروائے۔ تا کہ امت مسلمہ کا ہر فرد ان مشکلات سے نکل سکے۔

مصادر و مراجع:

Mansoori Dr. Muhammad Tahir Islamic law of Contracts and Business Transactions[کتاب]-Islamabad:Shari'ah Academy, International Islamic University,Islamabad,2009.

صحیح بخاری[کتاب]۔ باب: اثم من منع ابن السبیل من الماء8532:[گمنام] کتاب المساقاۃ

علی حافظ ذوالفقار معیشت وتجارت کے اسلامی احکام [کتاب] - لاہور: ابو ہریرۃ اکیڈمی 2010

غفاری ڈاکٹر نور محمد

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاشی زندگی [کتاب]-لاہور: دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور 1999.

منصوری ڈاکٹر محمد طاہر

احکام بیع [کتاب] - اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد 2005.

سیروسوانح

حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کا سانحہ وفات

حافظ محمد یونس اثری [1]

10 نومبر بروز اتوار جماعت کے عظیم عالم دین محقق شہیر جامع صفات النبیلہ حافظ ابو طاہر زبیر علی زئی رحمہ اللہ کے حوالے سے اطلاع ملی کہ وہ اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ یہ خبر ہر علم دوست شخص کے لئے انتہائی المناک تھی۔ شیخ محترم رحمہ اللہ پر فالج کا اٹیک ہوا تھا، تقریباً ڈیڑھ ماہ تک اسپتال میں زیر علاج رہے اور کبھی ہوش اور کبھی بے ہوشی کی اطلاعات ملتی رہیں۔ ملک کے طول وعرض میں شیخ رحمہ اللہ کے لئے دعائیں ہوتی رہیں۔ بلکہ وہ لوگ جو سرزمین مقدس میں فریضہ حج کے لئے بارگاہ الٰہی میں موجود تھے انہوں نے بھی شیخ رحمہ اللہ کے لئے خصوصی دعائیں کیں۔ بہر حال رب کو جو منظور تھا وہ ہوا شیخ محترم رحمہ اللہ اب اس دنیا فانی میں نہیں رہے۔ اور کسی عالم کا اس دنیا سے رخصت ہونا بہت بڑا سانحہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے کھینچ کر اس علم کو نہیں اٹھائے گا، بلکہ یہ علم، علماء کے چلے جانے سے ختم ہوگا، حتی کہ وقت آئے گا کہ کوئی عالم باقی نہیں

---

[1] مدرس المعہد السّلفی کراچی

رہے گا۔لوگ اپنے سردار جاہلوں کو بنالیں گے،ان سے سوالات پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے۔خود بھی گمراہ ہونگے اور لوگوں کو بھی گمراہ کرڈالیں گے۔ [1]

لہٰذا یقیناً شیخ رحمہ اللہ ایک عالم ربانی تھے،ان کی وفات بروئے حدیث ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کا نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں میں الشیخ عبدالحمید از ہر حفظہ اللہ نے پڑھایا۔نماز جنازہ میں علماء،طلباء سمیت کثیر تعداد نے شرکت کی۔ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے زائد افراد آپ کے نماز جنازہ میں شریک تھے۔

راقم الحروف کو شیخ رحمہ اللہ سے استفادہ وتلمذ کا شرف حاصل ہے کہ جب شیخ رحمہ اللہ نے مختصر دورہ اصول حدیث وعلم الرجال کروایا تو شیخ رحمہ اللہ کی زیارت اور استفادے کے لئے اس دورہ میں شرکت کی۔یقیناً میرے لئے اس دورہ میں شرکت بڑے شرف کی بات تھی۔اس دوران کئی علمی موضوعات کے حوالے سے مختلف اشکالات وحل طلب باتیں شیخ رحمہ اللہ کے سامنے رکھیں، بالخصوص اصول حدیث سے متعلق بہت کم وقت میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ان دودنوں میں شیخ رحمہ اللہ کی شخصیت کے حوالے سے جہاں تک جان سکا اور پھر بعد میں مزید جو معلومات ملی وہ سپرد قرطاس ہیں۔

آپ کی ولادت وتعلیم وتربیت:

آپ 25 جون 1957ء کو حضرو،ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام حاجی مجدد خان تھا۔آپ نے تین سے چار ماہ میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔آپ نے جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ سے سندفراغت حاصل کی ۔وفاق المدارس السّلفیہ سے الشھادۃ العالمیہ بھی حاصل کی ۔نیز آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے اسلامیات اور عربی میں ایم اے بھی کیا تھا۔آپ اپنی مادری زبان ہندکو کے ساتھ ساتھ کئی ایک زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔جن میں عربی،اردو،پشتو،انگلش،یونانی،فارسی (پڑھ اور سمجھ سکتے تھے ،بول نہیں سکتے تھے)اور پنجابی۔(راقم الحروف نے خود انہیں فون پر پنجابی میں گفتگو کرتے ہوئے سنا تھا) شامل ہے۔

آپ کوعلم الرجال سے بڑی دلچسپی تھی،چنانچہ خود لکھتے ہیں:''راقم الحروف کوعلم اسماء الرجال سے بڑا لگاؤ ہے'' [2]

---

[1] صحیح بخاری: کتاب العلم،باب کیف یقبض العلم، حدیث نمبر:100،صحیح مسلم: کتاب الزمان،باب رفع العلم وقبضہ وظھر الجھل والفتن فی آخر الزمان،حدیث نمبر: 2673

[2] مقالات:498/1

اساتذہ:

آپ کے اساتذہ میں جن عظیم علماء کے نام آتے ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

الشیخ محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ:

اپنے استاذ کے بارے میں آپ لکھتے ہیں: ''استاذ محترم مولانا ابو القاسم محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ سے میری پہلی ملاقات ان کی لائبریری ''مکتبہ راشدیہ'' میں ہوئی تھی، میرے ساتھ کچھ اور طالب علم بھی تھے۔''[1]

اسی طرح ایک جگہ لکھا: ''اگر مجھے رکن و مقام کے درمیان کھڑا کر کے قسم دی جائے تو یہی کہوں گا کہ میں نے شیخنا محب اللہ شاہ راشدی سے زیادہ نیک، زاہد اور افضل اور شیخ بدیع الدین شاہ سے زیادہ عالم و فقیہ انسان کوئی نہیں دیکھا۔ رحمہما اللہ''[2]

الشیخ بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ:

شاہ صاحب سے تعلق تلّمذ کا ذکر کرتے ہوئے حافظ صاحب رحمہ اللہ نے خود لکھا ہے: ''راقم الحروف کو بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔''[3]

اسی طرح ایک مقام پر الشیخ محب اللہ شاہ الراشدی اور الشیخ بدیع الدین شاہ الراشدی کے حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں: ''آپ انتہائی خشوع و خضوع اور سکون و اطمینان کے ساتھ نماز پڑھاتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ ہمیں آپ کے پیچھے نماز پڑھنے میں انتہائی سکون و اطمینان حاصل ہوتا، گویا یہ سمجھ لیں کہ آپ کی ہر نماز آخری نماز ہوتی تھی، یہی سکون و اطمینان ہمیں شیخ العرب والعجم مولانا ابو محمد بدیع الدین شاہ الراشدی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۱۶ھ) کے پیچھے نماز پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔''[4]

اسی طرح ایک جگہ کچھ یوں لکھا: ''راقم الحروف سے آپ کا رویہ شفقت سے بھرپور تھا۔ ایک دفعہ آپ

---

[1] مقالات: 494/1

[2] مقالات: 505/1

[3] مقالات: 491/1

[4] مقالات: 494/1

ایک پروگرام کے سلسلے میں راولپنڈی تشریف لائے تو کافی دیر تک مجھے سینے سے لگائے رکھا۔"[1]

الشیخ اللہ دتہ سوہدروی رحمہ اللہ:

حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں لکھا: "جن شیوخ سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، حاجی اللہ دتہ صاحب ان میں سرفہرست ہیں۔"[2]

علامہ مولانا فیض الرحمن الثوری رحمہ اللہ:

حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "راقم الحروف کو آپ سے استفادہ کا موقع استاذ محترم شیخ ابومحمد بدیع الدین شاہ الراشدی رحمہ اللہ کے مکتبہ راشدیہ، نیوسعید آباد میں ملا۔ آپ نے سند حدیث اور اس کی اجازت اپنے دستخط کے ساتھ ۱۳ صفر ۱۴۰۸ھ کو مرحمت فرمائی۔ آپ مولانا ابوتراب عبدالتواب الملتانی رحمہ اللہ سے اور وہ سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین"[3]

الشیخ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ: آپ مسلک کے عظیم علماء میں سے ایک نامور عالم دین تھے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سے ایک سنن النسائی کی عربی شرح التعلیقات السلفیۃ ہے۔

الشیخ حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ: آپ عالم باعمل شخصیت تھے۔ پچھلے سال ہی آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ بحر علم تھے۔ آپ کی کتب میں سے ارشاد القاری الی نقد فیض الباری، مرآۃ البخاری، مکالمات نورپوری، مقالات نورپوری اور احکام و مسائل اہل علم میں مقام عالی حاصل کر چکی ہیں۔

الشیخ حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ: آپ جماعت کے جید علماء میں سے ہیں۔ آپ کی مختلف کتب میں سے ایک تفسیر دعوۃ القرآن ہے۔

---

[1] مقالات: 492/1

[2] مقالات: 509/1

[3] مقالات: 508/1

الشیخ عبدالحمید ازہر حفظہ اللہ: حافظ صاحب رحمہ اللہ الشیخ عبدالحمید ازہر صاحب کو اپنا استاد مانتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان سے مختلف موضوعات میں رجوع کرتے رہتے تھے۔

تلامذہ:

پورے ملک سے طلبہ کی کثیر تعداد نے آپ سے کسب فیض کیا۔ جب راقم الحروف اصول حدیث کے دورہ میں جو حیدرآباد میں واقع مدرسہ تعلیم القرآن میں منعقد ہوا میں شریک ہوا تو اس موقع پر بھی اندرون سندھ سے مختلف مدارس کے اساتذہ وطلباء نے شرکت کی تھی۔

آپ کے تلامذہ میں سے جن چند ایکلے بارے میں ہم مطلع ہو سکے، ان کے نام درج ذیل ہیں۔

حافظ ندیم ظہیر:

آپ حافظ صاحب رحمہ اللہ کے ملازم شاگردوں میں سے ہیں جنھوں نے خصوصی التزام کے ساتھ شیخ صاحب سے کسب فیض کیا۔ شیخ صاحب کو آپ سے کافی امیدیں بھی تھیں۔ آپ شیخ صاحب کی زندگی سے ہی ماہنامہ الحدیث حضرو کے نائب مدیر ہیں۔ آپ ماشاء اللہ تحقیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں آپ کے بعض مقالات منظر عام پر آئے ہیں، جنھیں پڑھنے کا موقع ملا، جس میں حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کی تحریر کی جھلک بھی کبھی کبھی نظر آتی ہے۔

حافظ شیر محمد صاحب:

آپ بھی شیخ رحمہ اللہ کے ملازم شاگردوں میں سے ہیں اور حضرو میں واقع مدرسے کے مدرس بھی ہیں۔

الشیخ صدیق رضا صاحب:

آپ جامعۃ الدراسات کے استاذ ہیں۔ آپ کے بعض مقالات اور کتب پڑھنے کا موقع ملا۔ میدان مناظرہ میں آپ کی محنتیں اور جھود کافی ہیں۔ آپ مختلف موضوعات پر مختلف مکاتب فکر سے کئی مناظرے کر چکے ہیں۔

الشیخ غلام مصطفی ظہیر امن پوری: آپ کا شمار جماعت کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے، آپ ماہنامہ "السنۃ" کے مدیر بھی ہیں، جو کہ بڑا مؤقر رسالہ ہے۔

تصانیف:

شیخ رحمہ اللہ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

1. اثبات عذاب القبر للبیہقی تحقیق و تخریج
2. نیل المقصود فی التعلیق علی سنن ابی داؤد اس میں فقہی فوائد کے ساتھ ساتھ تخریج و تحقیق بھی ہے۔
3. نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم اور مقام
4. نور العینین فی اثبات رفع الیدین (یہ کتاب یقیناً اپنے باب میں انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے بڑی تعداد نے اس سنت متواترہ کو اپنی نماز کی زینت بنالیا)
5. اہل حدیث ایک صفاتی نام
6. آل دیوبند کے تین سو (300) جھوٹ
7. ہدیۃ المسلمین نماز کے اہم مسائل مع مکمل نماز نبوی
8. اختصار علوم الحدیث (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی کتاب کا ترجمہ ہے)
9. تحقیقی اصلاحی اور علمی مقالات جلد اول تا چہارم (ان میں ماہنامہ الحدیث میں شائع ہونے والے مضامین کو جمع کیا گیا ہے)
10. فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الاحکام دو جلدیں
11. القول المتین فی الجہر بالتأمین
12. آل دیوبند سے 210 سوالات
13. صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ (یہ کتاب منکرین حدیث کی کتاب اسلام کے مجرم کا جواب ہے)
14. مؤطا امام مالک، روایۃ ابن القاسم (تحقیق، تخریج و شرح)
15. مختصر صحیح نماز نبوی
16. دین میں تقلید کا مسئلہ

17 امین اوکاڑوی کا تعاقب

18 بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم

19 انوار الصحیفۃ فی احادیث الضعیفۃ

20 تحفۃ الاقویاء فی تحقیق کتاب الضعفاء

اس کے علاوہ اور بھی کتب ہیں۔ نیز کتب احادیث پر تحقیق وتخریج کا کام بھی کیا۔
تصنیفی خدمات کے علاوہ آپ نے ابطال باطل کے لئے مناظرے بھی کئے، بلکہ مناظروں کے لئے دور دراز کا سفر بھی کیا۔

شیخ رحمہ اللہ کے بعض خصائل نبیلہ:

❁ شیخ رحمہ اللہ کی تحریر انتہائی سلیس عام فہم اردو پر مشتمل ہوتی تھی، اور انداز ایسا تھا کہ انتہائی اختصار جو جامع و مانع ہو۔ تطویل واطناب آپ کی تحریر میں نظر نہیں آتا۔

❁ آپ رحمہ اللہ کی ایک عادت، شیخ خبیب صاحب حفظہ اللہ کو بہت اچھی لگی، جس کا انہوں نے تذکرہ کیا تھا، کہ دوران مطالعہ کوئی بھی لطیف نکتہ یا اہم بات آپ کو مل جاتی، تو اسے اپنی ذات تک یا اپنے حلقے تک محدود نہیں رکھتے تھے، بلکہ ماہنامہ الحدیث میں اسے ایک شذرے کے طور پر شائع کر کے تمام قارئین کے لئے عام کر دیتے۔

❁ آپ رحمہ اللہ انتہائی سادہ لوح، بے تکلف، ہنس مکھ ونرم مزاج آدمی تھے۔

❁ آپ رحمہ اللہ اہم معاملات میں اپنے اساتذہ سے بھی رجوع فرماتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے تعلیم وتعلم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود بتلایا تھا کہ وہ الشیخ عبدالحمید ازہر صاحب سے رجوع کرتے رہتے ہیں۔

❁ شیخ رحمہ اللہ کا انداز تدریس بھی ممتاز تھا۔ مسئلہ کی تفہیم اس آسانی سے فرماتے کہ طلاب العلم بآسانی سمجھ جاتے۔

شیخ رحمہ اللہ کے حوالے سے علماء کے تاثرات:

الشیخ رفیق اثری صاحب حفظہ اللہ: میں ان کی وفات کو جماعت کے لئے بہت بڑا نقصان اور سانحہ سمجھتا ہوں، رجال پر ان کی بہت گہری نظر تھی اللہ انہیں غریق رحمت کرے، آل دیوبند وغیرہ کے حوالے سے لکھنے

میں بھی ان کا انداز منفرد تھا، اگر چہ بہت سے لوگ ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے لیکن وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، مستحکم دلائل کے ساتھ اچھے انداز میں جواب دیتے تھے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے اور جماعت کو ان کا اچھا کوئی نعم البدل عطا کرے۔

الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی صاحب حفظہ اللہ:

وہ بڑے عظیم عالم دین تھے، بالخصوص علم الرجال میں وہ خاص ملکہ رکھتے تھے، کہ پورے پاکستان میں اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ نہایت سادہ طبیعت کے مالک تھے، زہد وتقوی اور قوی حافظہ ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔

الشیخ ارشاد الحق اثری صاحب حفظہ اللہ:

(راقم الحروف نے جب شیخ اثری صاحب حفظہ اللہ سے پوچھا کہ بعض لوگ اہل علم کی علمی آراء کو مختلف رنگ دے دیتے ہیں یا کچھ زیادہ ہی مبالغہ سے پیش کرتے ہیں۔۔۔۔اس پر شیخ صاحب فرمانے لگے) میرے ذہن میں رائی برابر اس قسم کا کوئی تحفظ نہیں تھا۔ یہ علمی آراء ہوتی ہیں، محدثین کے دور میں بھی اختلاف رہا ہے۔ اس میں نہ کوئی تڑپ کی بات ہے نہ سسک کی بات ہے۔ ویسے الشیخ زبیر علی زئی صاحب ماشاء اللہ! اللہ نے انہیں جو صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور جو ودیعتیں بخشی تھیں وہ انہی کا خاصہ ہیں۔ حدیث ورجال پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اللہ تعالی نے انہیں بڑا حفظ وضبط عطا فرمایا تھا۔ میں تو انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے، بلکہ اس سے بھی پہلے ان کی دکان پر بھی ان کے پاس آتا جاتا تھا۔ پھر وہ دارالدعوۃ سلفیہ آ گئے تھے۔ وہاں انہوں نے 3، 4 مہینوں میں قرآن مجید یاد کیا۔ اللہ نے انہیں بڑی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ لیکن ہر آدمی کا وقت اللہ کے یہاں مقرر ہے، آنے کا وقت بھی جانے کا وقت بھی۔ لیکن آپ بہت جلد ہی چلے گئے، جتنی ان سے توقعات تھیں کہ وہ اللہ کے فضل وکرم سے بہت کچھ حدیث کی خدمت سرانجام دیں گے لیکن وہ ادھوری رہ گئی ہیں اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور جو مساعی ہیں قبول فرمائیں اور جو کمی بیشی، کمزوریاں ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کی معاف فرمائے۔ (آمین)

تنبیہ:

شیخ ارشاد الحق اثری صاحب حفظہ اللہ کی یہ باتیں بڑی قابل غور ہیں۔خصوصاً اس لئے بھی کہ حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ اور الشیخ ارشاد الحق اثری و الشیخ خبیب صاحب وغیرہ کے علمی آراء کے مختلف ہونے کی وجہ سے تقلیدی طبقے کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔اسی طرح مسلک اہلحدیث کے بعض سادہ لوح عوام کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اہل علم کے یہ اختلافات علمی نوعیت کے ہوتے ہیں اس سے علی الاطلاق ان کے مابین تعلقات کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے اور نہ ہی ایسے موقع پر ہمیں ان علمی موضوعات کی کنہ کو سمجھے بغیر اپنی زبانیں ایسے عظیم علماء کے بارے میں دراز کرنی چاہئیں۔اور یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کا رد کیا اور افسوس کا اظہار کیا تھا کہ بعض لوگوں نے حافظ صاحب کی طرف یہ بات منسوب کی کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ ،ارشاد الحق اثری صاحب حفظہ اللہ کو اہل حدیث نہیں سمجھتے تھے۔حافظ صاحب رحمہ اللہ نے رد کیا تھا کہ یہ میری طرف جھوٹ منسوب کیا گیا ہے۔لہذا حافظ صاحب نے جب یہ وضاحت کر دی تھی تو یہ بات واضح ہوگئی کہ ان اہل علم یا دیگر اہل علم کے درمیان اختلاف کا ہوجانا کوئی قابل طعن بات نہیں۔محدثین کے درمیان بھی باہم اختلافات رہے بلکہ وہ طبقہ جو خود کو مقلد کہلاتا ہے ان کے درمیان بھی اختلافات ہیں اور ماضی میں بھی رہے ہیں۔

الشیخ مسعود عالم صاحب حفظہ اللہ:

وہ اپنے زمانے کے بہت نادر آدمی تھے۔اللہ نے انہیں بہت علم اور حافظہ عطا فرمایا تھا۔جماعت کے لئے انہوں نے بہت مخلصانہ کوششیں کی ہیں۔خاص طور پر حدیث نبوی کی خدمت کی۔ہر محاذ پر جہاں کہیں بھی سنت کے خلاف کسی نے آواز اٹھائی،آپ نے دفاع کیا۔مسالک کے متعصبین پیروکاروں کے خلاف انہوں نے بڑا عالمانہ جہاد کیا ہے۔اللہ رب العزت ان کے درجات بلند فرمائے۔اور اللہ رب العزت انہیں اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔(آمین)

الشیخ مبشر احمد ربانی صاحب حفظہ اللہ:

آپ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔اور اپنے ہم عصر علماء میں سے پاکستان کے اندر اسماء الرجال کے

زیادہ ماہر تھے۔اور گمراہ کن افکار کے حامل افراد کے خلاف کتاب وسنت کی روشنی میں بہت جلد میدان میں اتر آتے تھے، ماہنامہ الحدیث اس بات پر بہت بڑا شاہد ہے۔اسی طرح خدمت حدیث پر ان کی کتب اور مقالات ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔اسی طرح جب بھی اہل بدعت کے خلاف کوئی بھی مناظرے کا محاذ گرم ہوا تو شیخ زبیر علی زئی رحمہ اللہ اپنے رفقاء کے شانہ بشانہ چلے اور اپنے ساتھیوں سے بڑھ کر دلائل کی تیاری کے ساتھ میدان میں اترے۔اس طرح کا عبقری شخص سالوں بعد پیدا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو انبیاء، شھداء اور صالحین کا ساتھ نصیب فرمائے، اور انہیں جنت الفردوس کے اونچے مقام پر فائز کرے۔ اللہ تعالیٰ اہل حدیث علماء میں جو خلاء پیدا ہوا ہے، اس کو اپنی رحمت اور فضل کے ساتھ پُر فرمادے۔اور شیخ صاحب جیسی خوبیوں کا حامل عالم عطا فرمادے۔آمین یارب العالمین

الشیخ عبدالستار حماد صاحب حفظہ اللہ:

اسماء الرجال کے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔حنفیت کے حوالے سے بڑا جاندار تبصرہ ہوتا تھا۔اختلاف کو برداشت کرنے والے تھے۔اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔(آمین)

الشیخ خلیل الرحمن لکھوی صاحب حفظہ اللہ:

میدان تحقیق کے شہہ سوار تھے، آپ کی وفات سے جماعت کا بڑا نقصان ہوا ہے۔

الشیخ خبیب احمد صاحب حفظہ اللہ:

میری سب سے پہلی ملاقات ان سے 2006 میں ہوئی جب میں سخت سردی کے موسم میں ان سے استفادہ کے لئے ان کے علاقہ گیا تھا۔رات وہاں قیام کرنے کے بعد فجر کے بعد ہی شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ہم نے شیخ صاحب رحمہ اللہ سے صحیح مسلم کی "کتاب الامارۃ" سے چند احادیث پڑھی تھیں۔پھر اس کے بعد بھی شیخ صاحب رحمہ اللہ سے وقتاً فوقتاً فون پر گفتگو کا سلسلہ قائم رہا۔شیخ صاحب رحمہ اللہ کو کسی کتاب کے حوالے سے متعلق جب کوئی ضرورت محسوس ہوتی تو آپ فون پر رابطہ کرتے تھے۔اسی طرح جب ہمیں کسی کتاب کے حوالے سے کوئی پیچیدگی آتی ہم بھی شیخ رحمہ اللہ سے فون پر رجوع کرتے تھے۔کئی بار شیخ صاحب رحمہ اللہ ادارہ اثریہ تشریف بھی لائے۔بلکہ ایک بار شیخ رحمہ اللہ نے رات کا قیام بھی کیا

تھا۔شیخ رحمہ اللہ کی علمیت وخداد صلاحیت کے حوالے سے کوئی دورائے نہیں۔

الشیخ محمود الحسن صاحب حفظہ اللہ:

محدث شہیر حافظ زبیر علی زئی (تغمده الله بغفرانه و اسکنه فراديس الجنانه و فضله علی فوق کثیر من الناس یوم القیامة) بہت ہی عظیم عالم اور محدث تھے، میرا ان سے تعارف میرے دوست خورشید احمد کے ذریعے ہوا۔شیخ مرحوم جب بھی کراچی تشریف لاتے، انہی کے گھر قیام فرماتے۔اللہ نے ان کو علم کا بحر بیکراں بنایا تھا۔احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔چند سال پہلے دارالحدیث رحمانیہ کراچی میں ان کا درس بخاری بھی سنا تھا، بڑا معلوماتی اور محققانہ درس تھا۔ان کے درس سے میں نے بھی اپنی بہت سی غلط معلومات کی اصلاح کی تھی۔اسی طرح خورشید احمد صاحب کے مکان پر ان کا ایک درس توحید کے موضوع پر ہوا تھا، میں بھی اس سے بڑا مستفید ہوا۔نصف شعبان کی فضیلت پر ٹیلیفون پر ان سے گفتگو بھی ہوئی تھی جس میں کچھ تلخی بھی آ گئی تھی۔اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

بہرحال وہ علم کا پہاڑ تھے۔اللہ انکے درجات بلند فرمائے۔اسی طرح نابالغ بچے کی امامت کے موضوع پر بھی ان سے فتویٰ طلب کیا تھا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔بڑا ہی علمی اور مدلل جواب تھا، احناف کے مؤقف کی انہوں نے بڑی مؤثر تردید فرمائی تھی۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔(آمین)

یہ چند معلومات اور حافظ صاحب رحمہ اللہ کے حوالے سے علماء کے تاثرات قارئین نے ملاحظہ فرمائے۔یہ تاثرات اہل علم کے قلبی تعلقات کی واضح دلیل ہیں۔اللہ تعالیٰ استاذ محترم کی مغفرت فرمائے۔اور انکی تمام مخلصانہ کاوشوں کو شرف قبولیت عطا فرما کر ان کے لئے صدقہ جاریہ بنا دے۔اور فرزندان توحید کو بھی اسی لگن سے دین الٰہی کا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

سیر و سوانح

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی سیرت نگاری

قسط: 1

عبدالرشید عراقی (1)

شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ راقم مولانا ظفر علی خان کے ہمراہ شریک سفر تھا تو دوران سفر مولانا ظفر علی خان نے ایک طویل نظم بالبداہت ارشاد فرمائی ، جس کا مطلع تھا۔

مجھے ہی انتساب ہے ادب کے اس مقام سے ملی ہوئی ہے جس کی حد قدم گہ گلفام سے

اور اس نظم کا دسواں یا گیارھواں شعر تھا۔

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوگئی ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

میں نے استفسار کیا۔

مولانا ابوالکلام کے بارے میں آپ نے جو ارشاد فرمایا ہے وہ محض قافیہ کی بندش ہے یا فی الواقعہ آپ یہی سمجھتے ہیں

مولانا ظفر علی خان نے جواب میں ارشاد فرمایا:

---

(1) نامور مؤرخ و مصنف کتب کثیرہ

یہی سمجھتے ہیں

مولانا ظفر علی خان نے جواب میں ارشاد فرمایا:

جو شعر میں نے کہا ہے: وہ لفظاً نہیں معنا بھی درست ہے۔

دوسرا سوال میں نے یہ کیا:

کیا مولانا ابوالکلام آزاد قرآن فہمی کے باب میں اسلاف کے پیرو اور اس عہد کے مجتہد ہیں۔

مولانا ظفر علی خان نے ارشاد فرمایا:

بالکل اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے باب میں انہیں خاص ملکہ عطا کیا ہے۔ وہ حاضر کی فکری تحریکوں کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کی ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظام کائنات کی اساس رکھتے ہیں۔ ان پر بفضل ایزدی علم القرآن کے دروازے اس طرح کھلے ہیں کہ ان کے لیے کوئی سی راہ مسدود و منقطع نہیں۔ ان کی آواز قرآن کی آواز ہے۔

تیسرا سوال میں نے یہ کیا کہ:

مولانا ابوالکلام کے ترجمہ قرآن وتفسیر میں بڑی خوبی کیا ہے؟ اور وہ کونسا پہلو ہے جو دوسرے تراجم کے مقابلہ میں منفرد ہے۔

جواب میں مولانا ظفر علی خان نے ارشاد فرمایا کہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ وتفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن ہی کی زبان میں خطاب کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کے الفاظ الوہیت اور نبوت کا جامہ پہنے ہوئے ہیں اور یہ صرف اللہ کی دین ہے۔ دوسرے تراجم جواب تک ہندوستان میں ہوئے ہیں وہ قرآن کے الفاظ میں لغوی وتحتانی ترجمہ ہیں ان میں قرآن کے شکوہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ عربی الفاظ کا ترجمہ اردو الفاظ میں کیا گیا ہے۔ مطالب کی طاقت و پہنائی اوجھل ہوگئی ہے، آزاد کی تفسیر محض مقامی یا محض اسلامی نہیں، بین الاقوامی و بین الملی ہے، وہ الٰہیاتی زبان میں کائنات کو خطاب کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بلند پایہ صحافی تھے، 13 سال کے تھے جب آپ نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ صحافت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مولانا صحافت کے میدان میں اس وقت طلوع ہوئے

جب ہماری فضائے ادب روشن اور تابناک ستاروں سے مزین تھی۔ اردو کے عناصر خمسہ میں حالی، شبلی اور نذیر احمد زندہ تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے 13 جولائی 1912ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ الہلال جاری کیا، ہفت روزہ الہلال مختلف حیثیتوں سے اُردو صحافت میں ایک نیا باب تھا وہ صحیح معنوں میں ہماری سیاسی، صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ الہلال عصری صحافت میں محض ایک اور اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ اپنی ذات میں ایک مستقل تحریک تھا۔ جس نے طوفانِ حوادث میں اسلامیان عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا۔

الہلال محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صورِ قیامت تھا جس نے مردہ دلوں میں ایک نئی جان ڈال دی، وہ شعلہ قیامت جو سرد ہو رہا تھا۔ الہلال نے اس کو بھڑکا دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعے کلمہ حق بلند کیا اور جرأت و حق گوئی کی وہ مثال قائم کی جس کی ہماری صحافت کی تاریخ میں بالکل نئی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

’’اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاء پردرازی اور زور تحریر کے ساتھ اُنہوں نے انگریزی خواں نوجواں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا۔ اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی اور مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا‘‘۔ [1]

مولانا ظفر علی خان نے فرمایا:

الہلال بلاشبہ صور اسرافیل تھا۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی قبرستان میں قم باذن اللہ کہا اور اس صدا سے انہیں جگا دیا تھا۔ الہلال محض جریدہ ہی نہیں تھا بلکہ ہفتہ وار صحافت میں اس کا جواب نہ تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی جلیل القدر اور عہد آفرین شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ جو افکار وتصورات کی دنیا اور قوموں کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے علمی تبحر

---

[1] معارف اعظم گڑھ، اکتوبر 1932ء، ص:313

اور فضل وکمال کے ساتھ جامع الصفات والکمالات تھے وہ بیک وقت بہت بڑے خطیب اور مقرر تھے۔

حسرت موہانی فرماتے ہیں:

سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت   گویا.... ہیں... ابوالکلام آزاد

وہ مورخ بھی تھے اور محقق بھی، وہ مجتہد بھی تھے اور فقیہ بھی وہ علم وفن کے امام تھے۔ وہ محدث بھی تھے اور ادیب بھی، وہ عظیم مفکر وحکیم اور دانائے راز تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نقاد بھی وہ معلم بھی تھے اور مبصر بھی، وہ میدان سیاست کے مدیر بھی تھے۔ وہ عرصہ جہاد کے شہسوار بھی۔ وہ ذکاوت، ذہانت، عدالت، فطانت، ثقاہت، فہم وفراست، فکر وتدبر کی گہرائی اور دیدہ وری اور نکتہ رسی میں ان کا کوئی معاصران کا حریف نہ تھا۔ وہ بہت بڑے دانشور اور نثر نگار بھی تھے۔ حسرت موہانی فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر   نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اور مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا تھا:

''میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی''۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے بارے میں مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم اپنے ایک مقالہ ''الہلال کا مطالعہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''راقم نے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی زبانی سنا کہ مولانا شبلی فرمایا کرتے تھے کہ میں ایجاز کا بادشاہ ہوں اور ابوالکلام اطناب کا بادشاہ ہے یعنی مولانا شبلی کو پھیلی ہوئی چیز سمیٹ کر لکھنے میں مہارت تھی اور مولانا ابوالکلام کو سمٹی ہوئی چیزوں کو پھیلا کر پیش کرنے میں کمال حاصل تھا جس کے لیے وہ اعادہ وتکرار کا سہارا لیتے تھے اسی لیے ان کی تحریروں میں الفاظ کے لشکر امنڈتے نظر آتے ہیں۔ [1]

مولانا ابوالکلام آزاد کو امام اہل السنۃ احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بہت زیادہ محبت وعقیدت تھی ان دونوں ائمہ کرام کے بارے میں اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ'' میں جن الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ ان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور شیخ

[1] مولانا ابوالکلام آزاد ایک شخصیت، ایک مطالعہ، ص:148

الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے کتنی محبت اور عقیدت تھی اور نثر نگاری میں مولانا ابوالکلام آزاد کس مرتبہ ومقام کے حامل تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ

''تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنہ اعتزال وتعمق فی الدین اور بدعت مُضلّہ، تکلم بالفلسفہ وانحراف از اعتصام بالسنۃ نے سر اُٹھایا اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگا تار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیر استبداد وقہر حکومت نے اس فتنے کا ساتھ دیا حتی کہ بقول علی المدینی رحمہ اللہ کے فتنہ ارتداد ومنع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے بعد یہ دوسرا فتنہ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا تو کیا اس وقت علمائے امت اور ائمہ شریعت سے عالم اسلام خالی ہو گیا تھا۔ غور تو کرو۔ کیسے کیسے اساطیر علم وفن اور اکابر فضل وکمال اس عہد میں موجود تھے۔ خود بغداد اہل سنت وحدیث کا مرکز تھا مگر سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور عزیمت دعوت وکمال مرتبہ وراثتِ نبوت وقیامِ حق وہدایت فی الارض والامت کا جو ایک مخصوص مقام تھا وہ صرف ایک قائم لامر اللہ کے حصے میں آیا یعنی سید المجددین وامام المصلحین جناب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ۔ [1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ: امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایسے اصحاب کمال وائمہ علم تھے جو اس عہد میں موجود تھے با ایں ہمہ یہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے۔ اور ہر صاحب بصارت پر روشن کہ مقام عزیمت دعوت کا جو ایک خاص مقام ہے وہ ان میں کسی کے حصے میں نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہی کے لیے تھا۔ سب اپنے دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے لیکن انہوں نے وہ سب کام بھی ان سے بہتر کئے جو وہ سب کر رہے تھے پھر اُن سے بڑھ کر یہ کہ سب کو راہ عزیمت دعوت وتجدید واحیاء ملت ورفع اعلام سنت واخماد شروبدعت وکشف وابراز معارف مستورہ کتاب وسنت وغوامض وسرائر معارف وحکمت نبوت وانفجار

---

[1] تذکرہ، ص: 134، مطبوعہ مکتبہ جمال، لاہور

ینابیع الحکمت من اللسان والجنان والجہاد فی سبیل اللہ بالسیف والقلم واللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور علوم والکمال وہبیہ وسماویہ کی ان بلندیوں پر تنہا جا کر کھڑے ہوئے۔ جہاں ان کے اقران ومعاصرین کے وہم وتصور کو بھی یارا نہیں حتی کہ خود ان کے معاصرین کو یک زبان و یک قلم ہو کر اعتراف کرنا پڑا۔

"ما رأینا مثله و إنه ما رأی مثل نفسه"

نہ تو ہماری آنکھوں نے اس کا مثل دیکھا نہ خود اس کو اپنا سا کوئی نظر آیا۔

اے تو مجموعہ خوبی، بچہ نامت خوانم[1]

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ:

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ

پھر 12 ویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم ومعارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چلی تھی پھر بھی کھیتوں کی سبزی اور چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ 13 ویں صدی کے تمام کاروبار علم وطریقت کے اکابر واساتذہ اسی صدی میں سر برآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل درس وتدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں۔ جیسے خاندان فرنگی محلی، اور ہندوستان سے باہر بلاد عربیہ وعثمانیہ میں اکثر مشاہیر علم وارشاد جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفراینی النجدی، سید عبدالقادر کوکبانی، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسمعیل یمانی، شیخ عبدالخالق زبیدی، علامہ فلائی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم کو شاہراہ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا وحق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دور آخر کے ''فاتح'' اور ''سلطان عصر'' ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے لیے تھا اور لوگ بھی بیکار نہ رہے، کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لیے تھا۔

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز گرم دارد زتو ہنگامہ.......رسوائی را[2]

مولانا حسرت موہانی نے سچ فرمایا ہے اور اس میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پر

---

[1] تذکرہ، ص:159-160 [2] تذکرہ، ص:267-268

مبنی ہے۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت:

مولانا ابوالکلام آزاد ایک عظیم علمی شخصیت تھے اور غیر معمولی ذہن ودماغ کے انسان تھے۔ وہ اپنے علم وفضل، سیرت واخلاق، تہذیب وتمدن، عدالت وثقاہت ، شجاعت وبسالت، ذکاوت وفطانت، فہم وبصیرت، زہد وورع، تقویٰ وطہارت، فکر وتدبیر کے لحاظ سے عالم اسلام کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر مرحوم:

''مولانا آزاد ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف ومحاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوتے ہیں اُنہوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جس کا حصر مشکل ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی دائمی فخر کا سامان ہوسکتا ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ذوق نظر کے مطابق علم وعمل کے مختلف میدانوں میں متعدد علوم وفنون اور ملک وملت کی بیش از بیش خدمات انجام دیں تھیں۔ ان کے علم ونظر کے کمالات، اخلاق وسیرت کے خصائص اور خدمات کی جلالتِ قدر نے انہیں دنیا کے عظیم انسانوں میں لا کھڑا کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد علوم اسلامیہ کا بحر زخّار تھے جامع الکمالات تھے۔ انہیں ہر علم وفن سے مناسبت تھی۔ دین ومذہب، تاریخ وسیر، فلسفہ وحکمت، شعر وادب، علم الالسنہ، آثار قدیمہ، اور اللہ جانے کس دائرہ علم وفن میں وہ یگانہ روزگار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت حافظہ کی غیر معمولی قیمت سے نوازا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ نظر سے گزر گئی وہ حافظہ کے سینہ میں محفوظ ہوجاتی تھی، ہزاروں عربی، فارسی اور اُردو کے اشعار انہیں زبانی یاد تھے۔

مولانا علم وعمل دونوں کے تاجدار تھے انہیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا انہوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دلنشیں تحریرات یا پُر تاثیر خطابت تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی

حرارت سے معمور تھا۔ بقول مشفق خواجہ:

''ابوالکلام آزاد ایک فرد کا نام ہی نہیں بلکہ ہندو پاکستان کی گزشتہ نصف صدی کی تہذیبی، ثقافتی، علمی وادبی اور مذہبی وسیاسی تاریخ بھی ہے۔ اس انسانی پیکر میں علم وفضل کی ایک دنیا آباد تھی ان کی ہمہ گیر شخصیت علم وکمال کی ان تمام بلندیوں سے آشنا تھی جو کسی بھی انسان کے لئے سرمایہ افتخار ہوسکتی ہیں ان کی تحریر وتقریر کے جادو نے نہ صرف یہ کہ علم وادب کی دنیا کو ہمہ ثریہ آسمان کر دیا بلکہ برصغیر ہندو پاکستان کے عوام کو سامراجی حکومت کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت بھی دلائی گئی وہ ایک قدر اول کے انشا پرداز اور بلند خیال مفکر کی حیثیت سے اپنی مثال آپ تھے اور ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں وہ تنہا ہیں اور ان کا کوئی حریف نہیں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد یقیناً ایک نادر روزگار شخصیت تھے جن کے انوار نے ہماری نگاہوں کے ہاتھ میں علم وآگاہی کی مشعلیں دے کر ایک طرف اسلاف کرام کے عہد مسعود کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کرایا اور دوسری طرف آئندہ منزلوں کے سنگ ہائے میں موقع بہ موقع نصیب فرمادیئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے عہد کے بلند پایہ خطیب تھے انہوں نے اپنی خطابت سے برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا اور خطابت کو انہوں نے اپنی دعوتِ ملّی کو فروغ واشاعت کا ذریعہ بنایا قوم میں سرفروشی کا جذبہ اور اسلامی زندگی کا ذوق پیدا کرنے میں اس سے کام لیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ملکی سیاست سے بھی تھا اور ان کا شمار برصغیر کے نامور سیاستدانوں میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری مولانا کی سیاسی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ابوالکلام آزاد ایک سیاستدان بھی تھے ان کا شمار اس عہد کے نامور مدبروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے برصغیر کی سیاست میں اپنے فکر وتدبر کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں یہ نقوش ملک کی سیاسی زندگی کے ہر دائرے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فہم وبصیرت کے مطابق ایک خاص جماعت کو اپنی سیاسی تگ وتاز کا میدان بنایا لیکن ان کی بصیرت ورہنمائی کی کارفرمائیاں نہ صرف کانگریس کی قراردادوں کی اصلاح وتزیین اور متحدہ قومی مقاصد کے مطابق اس کے فیصلوں میں دیکھی جاسکتی ہیں بلکہ مجلس خلافت اور جمعیت علماء ہند کی سیاست اور تعمیر وخدمت قوم وملت کے کاموں میں، مجالس احرار اسلام کے قیام میں،

مومن کانفرنس، جمعیۃ القریش پولیٹکل کانفرنس، مسلم مجلس کے پیش نظر مقاصد اوران کی قومی وملی خدمات میں حتی کہ مسلم لیگ کے نصب العین کی تبدیلی اور جماعت اسلامی کی تشکیل ومقاصد میں رنگ لائی ہیں۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد کا سوانحی خاکہ:

17 اگست 1888ء میں مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولانا خیرالدین تھا۔ 1892ء میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ 1898ء میں ہندوستان تشریف لائے والد محترم کے علاوہ دوسرے اساتذہ کرام سے بھی استفادہ کیا۔ 1899ء میں اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا۔ 1903ء میں درس نظامی کی تکمیل کی ان کے اساتذہ میں شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی آتا ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر مرحوم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''فقیر اپنے تجسّس کی خاطر غالب کے قدیم مکان اور محلہ پھاٹک حبش خاں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی دوران ایک مطبوعہ فہرست ایسی مل گئی جس سے یہ نشان دہی ہوئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد پھاٹک حبش خاں کے قریب مولانا سید نذیر حسین کی مسجد میں زیر تعلیم رہے اور مولانا سید نذیر حسین کے شاگر......قریب ہی مولانا سید نذیر حسین کا رہائشی مکان تھا جس میں یادگار چیزیں محفوظ تھیں ان میں ایک جبّہ اور دستار بھی تھی جو حکومت حجاز کی طرف سے دی گئی تھی۔ غالب کا رہائشی مکان اور مولانا سید نذیر حسین کی مسجد وغیرہ فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے نہایت پژمردہ حالت میں تھے میں نے واپسی پر مولانا سے ذکر کیا۔ فرمایا:

''بھائی تم کہاں جانکلے اور میرا ماضی ڈھونڈ نکالا۔''[2]

نومبر 1903ء میں کلکتہ سے ماہنامہ لسان الصدق جاری کیا۔ اکتوبر 1905ء میں ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے مدیر معاون بنائے گئے اور مارچ 1906ء میں الندوہ سے علیحدگی اختیار کر کے سہ روزہ وکیل سے وابستہ ہوگئے اور اگست 1908ء میں والد کی شدید علالت کی وجہ سے استعفیٰ دے کر کلکتہ چلے گئے۔ 15 اگست 1908ء کو ان کے والد مولانا خیرالدین نے انتقال کیا۔ 13 جولائی 1912ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد از مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ص:24

[2] بزم ارجمنداں از مولانا محمد اسحاق بھٹی، ص:90

الہلال جاری کیا جو 16 نومبر 1914ء تک جاری رہا۔ نومبر 1915ء میں البلاغ جاری کیا۔ جو اپریل 1916ء تک جاری رہا۔ 1919ء میں آپ کی دو کتابیں تذکرہ اور "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد" شائع ہوئیں۔ ستمبر 1931ء میں آپ کی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی اور اپریل 1936ء میں دوسری جلد شائع ہوئی۔ 1939ء میں آل انڈیا کانگریس کے قائم مقام صدر بنائے گئے۔ اپریل 1943ء میں آپ کی اہلیہ محترمہ کا کلکتہ میں انتقال ہوا اور مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے۔ جون 1945ء میں شملہ کانفرنس میں کانگریس کے رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ 1946ء میں آپ کی دو کتابیں ''غبار خاطر'' اور ''کاروان خیال'' شائع ہوئیں۔ 15 اگست 1947ء کو آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم بنائے گئے۔ 19 فروری 1958ء کو فالج کا حملہ ہوا اور 22 فروری 1958ء کو اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان اُردو پارک میں دفن کئے گئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ

مولانا غلام رسول مہر مرحوم لکھتے ہیں کہ:

مولانا کو خود بھی بعض اوقات یہ احساس ہوا تھا کہ جس دور میں وہ پیدا ہوئے اور جن حالات میں انہیں زندگی گزارنی پڑی وہ ان کے لئے سازگار نہ تھے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ معلوم نہیں میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی!

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا رونق گشتم واز طالع دکان رفستم

مولانا ابوالکلام کا عقیدہ اور دینی مسلک:

مولانا ابوالکلام آزاد کا وہی عقیدہ تھا جو تمام مسلمانوں کا ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد اب نجات اخروی کا دارومدار صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور قرآن مجید کی پیروی پر ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے رسولوں پر ایمان اور سابقہ کتب سماوی پر ایمان اور ان کے مطابق عمل سے اب نجات اخروی نہیں ہے۔

میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر میں امام اہل السنۃ احمد بن حنبل اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہم اللہ تعالیٰ کے افکار ونظریات کے ترجمان تھے۔فکری اور عملی اعتبار سے منہج سلف کے نمائندہ تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا ابوالکلام کے دینی مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

’’مولانا مذھباً سلف صالحین کے مسلک پر استوار تھے اور عقائد میں مسلک سلف سے تجاوز گوارا نہ تھا لیکن عمل میں بڑے روادار تھے۔ ہندوستان میں مسلک سلف کے ماننے والے اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں اور عرب ملکوں میں ان کا نام ’’سلفی‘‘ ہے۔[1]

سیرت نبوی ﷺ:

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے ایک اللہ تعالیٰ کا کلام، دوسرے انبیائے کرام کی شخصیتیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت ورہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک منشا پورا کرنے کے لئے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم وملزوم رہی ہیں کہ ان میں کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہوسکا اور وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہوسکا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید اور سیرت محمد ﷺ دونوں ایک ہی بحر ناپیدا کنار ہیں۔کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا البتہ جس چیز کی کوشش کی جاسکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی اس کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روح دین تک رسائی پائے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لئے ہمیشہ سے دو ذرائع کو پیش کیا ہے ایک آسمان سے نازل ہونے

---

[1] ذکر آزاد، ص:134

[2] سیرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم

والی وحی کے متون اور دوسرے حاملین وحی جنہیں منصب رسالت کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔کاروانِ رسالت کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوا۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔آج دنیا میں 6780 زبانیں اظہار کا ذریعہ ہیں۔ان میں سے ہر اہم اور قابل ذکر زبان میں تذکار رسالت موجود ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل انبیائے کرام کی جامع تفصیلات ہمارے پاس موجود نہیں مگر خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ اور اسوۂ حسنہ کا ایک ایک پہلو تاریخ میں موجود اور تعامل امت میں محفوظ ہے۔قرآن مجید اس سیرت کا سب سے مستند اور معتبر ماخذ ہے احادیث مبارکہ میں کارنامہ رسالت کی ہر تفصیل پوری سند کے ساتھ موجود ہے۔

علوم اسلامیہ کا افتخار جن موضوعات اور مضامین کے ساتھ وابستہ ہے ان میں ایک ''سیرت نگاری'' ہے ''سیرت'' کا لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت سے اسلامی دنیا میں اپنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔یہ وہ موضوع ہے جس پر گزشتہ 14 صدیوں سے عقیدت مندوں نے ہزاروں جواہر پارے تیار کیے ہیں اور یہ سلسلہ سعادت ہنوز اپنی پوری ایمانی شان اور روحانی شوکت کے ساتھ جاری وساری ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سدابہار موضوع ہے ہر عہد میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق سیرت نگاروں نے اپنی عقیدت اور قلم کے جواہر پارے پیش کیے ہیں۔سیرت نگاروں کا یہ عمل سیر، مغازی، دلائل، شمائل اور مدارج کے عنوان کے تحت قلمبند ہوتا رہا ہے۔

19 ویں اور 20 ویں صدی میں سیرت نگاری کے متنوع موضوعات پر ہر زبان میں سینکڑوں کتابیں تصنیف وتالیف ہوئیں ان کتابوں میں اُردو زبان کو ہر اعتبار سے سبقت حاصل ہے۔اُردو زبان میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شاہکار کتب لکھی گئی ہیں اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ لکھی جائیں گی۔

قرآن مجید نے ''وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ'' کی صدا جو بلند کی اس کا فیضان ہر اعتبار سے قیامت تک جاری رہے گا۔آیات قرآنیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے متنوع پہلوؤں کو آشکارا کیا گیا ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ زندگیاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا انعکاس ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے عقیدہ وعمل کی حفاظت، تحقیق، تدریس اور تعلیم کے لئے بیسیوں علوم وفنون پیدا

کیئے۔ مگر اسلامی ادبیات کے اس ذخیرے میں حدیث اور سیرت کو سب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ سیرت کا موضوع ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اور تاریخ عالم میں صرف ایک شخصیت کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ مقدس شخصیت خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

وہ دانائے رسل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہ [1]

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اردو زبان میں چند مشہور کتابیں:

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عربی زبان میں ہزاروں کتب موجود ہیں عربی زبان کے بعد ان خوش نصیب زبانوں میں اُردو زبان کو یہ سعادت حاصل ہے جس میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے وسیع کتب لکھی گئی ہیں۔

اُردو زبان انسانی تہذیب کی آخری زبان ہے جس کے لسانی اور ادبی امکانات بہت وسیع اور روشن ہیں۔ بقول پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم

''اس زبان کے تہذیبی اور لسانی رچاؤ نے اسلوبیاتی حسن وکمال میں بہت گرانقدر اضافے کیئے ہیں''۔

ذیل میں چند مشہور کتب کی ایک مختصر فہرست پیش خدمت ہے۔

1۔ رحمۃ للعالمین، مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری
2 سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلد اول، مولانا شبلی نعمانی
3 سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد دوم، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی
4 سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد سوم تا ہفتم، مولانا سید سلیمان ندوی
5 اصح السیر، مولانا عبدالرؤف دانا پوری
6 سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی
7 اسلامی تاریخ، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری

---

[1] ماخوذ از مرقع سیرت پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ

8 النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا مناظر احسن گیلانی
9 سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی
10 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی
11 محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، حیدر آبادی
12 پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی
13 رہبر کامل، مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی
14 سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا سید مودودی
15 نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
16 ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، پیر محمد کرم شاہ الازہری
17 سیرت المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا محمد ادریس کاندہلوی
18 محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا نعیم صدیقی
19 انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم، ڈاکٹر خالد علوی
20 حیات محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی
21 سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی
22 الرحیق المختوم، مولانا صفی الرحمان مبارکپوری
23 پیغمبر اعظم وآخر، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
24 سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم، حکیم محمود احمد ظفر
25 حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، ملا واحد دہلوی
26 اسوۂ کامل صلی اللہ علیہ وسلم، ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
27 پیغمبر امن ورحمت، ڈاکٹر عبدالغفور راشد
28 سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم، فضل کریم درّانی
29 سیرت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم، ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری

30 سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے آئینے میں، ڈاکٹر عبدالغفور راشد
31 الصادق الامین، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی
32 حیات امی صلی اللہ علیہ وسلم، پروفیسر خالد مسعود
33 ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا محمد ولی رازی
34 رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا سید سلیمان ندوی
35 سیرت الاسلام، مولانا سید نواب علی حسن خان
36 سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری
37 مہر نبوت، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری
38 سیرۃ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
39 سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری
40 سیرت محمدی، مولانا محمد بن ابراہیم جونا گڑھی
41 سیرت مقدس، مولانا محمد داؤد راز دہلوی
42 مقدس مجموعہ، مولانا محمد داؤد راز دہلوی
43 سید الکونین، مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی
44 رسالت کے سائے میں، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن الازہری
45 سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا ابوبکر شینت جون پوری
46 اسوۂ حسنہ، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
47 پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا منیر احمد وقار/ اشفاق احمد خان/ پروفیسر حمید اللہ
48 رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی
49 سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ادارتی ٹیم، دارالسلام، لاہور
50 محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم (صبر وثبات کے پیکر) مولانا عبدالرحمان کیلانی

سیرت سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف:

مولانا ابوالکلام آزاد کی درج ذیل کتابیں ہیں:

1 انبیائے کرام علیہم السلام
2 خصائص محمدیہ
3 ولادت نبوی
4 سیرت طیبہ ماخوذ از قرآن مجید
5 رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
6 ختم نبوت

انبیائے کرام علیہم السلام:

یہ کتاب ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات پر الہلال اور البلاغ یا ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کے مرتب مولانا غلام رسول مہر مرحوم ہیں۔ اس کتاب میں جن انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات بیان کئے گئے ہیں ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

1. حضرت نوح علیہ السلام 2. حضرت ھود علیہ السلام 3. حضرت صالح علیہ السلام
4. حضرت ابراہیم علیہ السلام 5. حضرت یوسف علیہ السلام 6. حضرت موسیٰ علیہ السلام
7. حضرت شعیب علیہ السلام 8. حضرت ایوب علیہ السلام 9. حضرت داؤد علیہ السلام
10. حضرت سلیمان علیہ السلام 11. حضرت یونس علیہ السلام 12. حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اس کتاب کا مقدمہ مولانا مہر نے لکھا ہے جو دو مقالوں پر مشتمل ہے، ایک میں سیر انبیاء کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں مخصوص دعوتوں پر کیوں اکتفا کیا گیا۔

پہلے مقدمہ میں مولانا مہر مرحوم ایک ذیلی عنوان ''کامرانیاں اور محرومیاں'' کے تحت لکھتے ہیں:

چنانچہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ دوسرے طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کو سرگزشتیں بار بار سناتا ہے پھر جابجا ان سے عبرت و بصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے جن پر اقوام و جماعات کا عروج و زوال موقوف ہے وہ کھول کھول کر بتلاتا ہے کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت و کامرانی ان ان اعمال کا انعام تھی اور مغضوب و گمراہ جماعتوں کی شقاوت و محرومی ان ان بدعملیوں کی پاداش تھی۔ اچھے نتائج کو ''انعام'' کہتا ہے کیونکہ یہ فطرت الٰہی کی قبولیت ہے بُرے نتائج کو ''غضب'' کہتا ہے کیونکہ یہ قانون الٰہی کی پاداش ہے وہ کہتا ہے جن اسباب و علل سے دس مرتبہ ایک خاص معلول پیدا ہو چکا ہے تم کیونکر کہہ سکتے ہو کہ گیارہویں مرتبہ ایسا معلول پیدا نہ ہوگا۔

((قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ)) (137/3)

’’تم سے پہلے بھی دنیا میں اللہ کے احکام وقوانین کے نتائج گزر چکے ہیں پس ملکوں کی سیر کرو، اور دیکھو ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام وقوانین کو) جھٹلایا تھا۔‘‘ (صفحہ:9-10)

دوسرے مقدمہ میں ’’بے شمار قومیں‘‘ کے ذیلی عنوان کے تحت مولانا مہر مرحوم لکھتے ہیں:

’’یہ ظاہر ہے کہ قومیں بے شمار گزر چکی ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسب تصریح قرآن ہر قوم میں دعوت حق کا ظہور ہوا ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ بے شمار قومیں اور بے شمار دعوتیں ہوئیں جن میں سے قرآن نے صرف چند ہی کا ذکر کیا باقی کا نہیں کیا قرآن نے ایسا کیوں کیا؟۔‘‘

اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن کا مقصود ان سرگزشتوں کے بیان سے یہ نہیں تھا کہ تاریخ کی طرح تمام واقعات کا استقصاء کیا جائے بلکہ تذکیر وموعظت تھا اور تذکیر وموعظت کے لئے اس قدر کافی تھا کہ چند دعوتوں اور قوموں کی سرگزشتیں بیان کر دی جائیں اور باقی کے لئے کہہ دیا جاتا کہ ان کا حال بھی انہی پر قیاس کرلو۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں ان کا اسلوب بیان ہر جگہ عام ہے جابجا اس قسم کی تعبیرات پائی جاتی ہیں کہ پچھلی قوموں میں ایسا ہوا، پچھلی آبادیوں میں ایسا ہوا، پچھلے رسولوں کے ساتھ اس طرح کے معاملات پیش آئے۔ البتہ جہاں کسی تخصیص کے ساتھ ذکر کیا ہے وہاں صرف چند قوموں کی سرگزشتیں بیان کی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ چند سرگزشتیں پچھلی قوموں کے ایام ووقائع کا نمونہ سمجھی جائیں اور ان سے اندازہ کرلیا جائے کہ اس بارے میں تمام اقوام عالم کی رویدادیں کیسی رہ چکی ہیں۔

البتہ کہا جاسکتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان چند قوموں ہی کا ذکر کیوں کیا گیا جو ایک خاص خطۂ ارضی میں گزر چکی تھیں۔ دوسرے خطّوں کے اقوام میں سے کسی کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ (صفحہ:20)

اب ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی چند تحریریں ملاحظہ فرمائیں۔

1 حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات میں ’’حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ‘‘ کے عنوان سے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات صاف بتاتے ہیں کہ ایسی حالت میں کیا طریقہ اختیار کرنا

چاہیے۔ دنیا میں اس وقت وہی ایک مسلمان تھے مگر نہ تنہائی انہیں دعوت الی الحق سے مانع ہو سکی اور نہ انہوں نے ردمظالم اور تغییر منکر کے لئے صرف وظیفہ قلب وزبان تک ہی کفایت کی مگر جب یہ کوشش سودمند نہ ہوتے دیکھی تو دست وبازو سے بھی طاقت آزمائی کے لئے آمادہ ہوئے پس ایمانداروں کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پیروی کریں۔

دعوت الی الحق کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے یہی صورت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کی اوراسی کی تعلیم اظہار دعوت کا حکم دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی تھی کہ

((وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ))

''اپنے قریب ترین اعزہ کو ڈراؤ۔''

اس منادی میں کامیابی ہو یا ناکامی، تاہم تجربہ واختیار اور بصیرت کو اس سے مدد ملے گی پھر دعوت عام کے لئے اسکیم مرتب کرنے میں صرف دماغ کی قوت متخیلہ ہی پر زور دینا نہ پڑے گا بلکہ تجربہ وعمل کے نتائج سامنے ہوں گے۔

دعوت الی الحق کو مداہنت، پاس مراتب، لحاظ عظمت سے کچھ سروکار نہیں کسی بزرگ کی بزرگی یا کسی عزیز کی محبت کا اس پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے۔ اولاد پر والدین سے زیادہ کس کے احسانات ہوں گے لیکن دیکھتے نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو کچھ کہنا تھا۔ سب سے پہلے اپنے باپ ہی سے کہا اور جو کچھ کرنا تھا اس کے سرانجام میں باپ کے حقوق ابوت ذرا بھی مانع نہ ہو سکے۔

احیاء صداقت اور اقامت حق وعدل کے لئے مخفی تدابیر بھی کرنی پڑتی ہیں۔ پوشیدہ طور پر تاکید وتدبیر سے بھی کام لینے کی حاجت پڑتی ہے۔ اور اس مدعا کے لئے یہ تمام باتیں جائز ودرست بلکہ ضروری ولازم العمل ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت خانے میں کیا کیا تھا؟

کفر وشرک اور استبداد نے دلوں میں خواہ کیسی تاریکی پھیلا دی ہو، انسان اپنی انسانیت سے کتنا ہی گزر گیا ہو، امتیاز حق وباطل کی طاقتیں مردہ ہی کیوں نہ ہو جائیں، تاہم حقیقت ایک ایسی چیز ہے کہ اخلاص کے ساتھ مؤثر انداز میں جب اسے پیش کیا جائے گا تو سخت سے سخت منکروں کے سر بھی اس کے آگے جھک جائیں گے۔ مستبدین کے غرور وجبروت سے مرعوب ہو کر دعوت الی الحق کی تحریک رد نہیں کی جاتی اور اگر رکتی بھی ہے تو اس طرح کہ

رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ صفحہ:166 تا167

2 حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر میں قید ہونا اور قید سے رہائی کے بعد تخت مصر پر متمکن ہونا۔ اس بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد ''قید خانہ اور تختِ مصر'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ

''لیکن پھر غور کرو، دنیا میں کونسی بات اس سے زیادہ عجیب ہوسکتی ہے کہ اسی قیدی کے لئے اچانک قید خانے کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور کھولنے والا کون ہوتا ہے خود مصر کا بادشاہ اور کیوں کھولتا ہے اس لئے کہ ایک عبرانی قیدی کو قید خانے سے نکالے اور مصر کے تخت فرمانروائی پر بٹھادے گویا مصر کے قید خانے اور مصر کے تخت حکومت کا درمیانی فیصلہ ایک قدم سے زیادہ نہ تھا اس نے قید خانے سے قدم اُٹھایا اور تخت فرمانروائی پر قدم رکھ دیا۔

ملے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

پھر اس عجیب وغریب انقلاب کا نتیجہ کیا نکلا ایسا کہ ان ساری باتوں سے بھی زیادہ عجیب ہے اور جسے قرآن کی ایجاز بلاغت نے صرف ایک جملہ میں واضح کردیا۔

((وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ)) (یوسف:56)

اللہ تعالیٰ نے سرزمین مصر میں اس کے قدم اس طرح جمادیئے کہ اس کے جس حصے کو چاہے اپنے کام میں لائے۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام خاندان کو کنعان سے مصر بلایا اور عین دارالحکومت میں کہ ''جشن'' کی سرزمین تھی۔ عزت واحترام کے ساتھ وہ بسائے گئے اب وہی صحرا کے بدوی جو مصر میں قابل نفرت سمجھے جاتے تھے۔ مصری دارالحکومت کے معزز باشندے ہوگئے اور وہاں ان کی نسل میں اس درجہ برکت ہوئی کہ جب چار سو برس کے بعد مصر سے نکلے تو کئی لاکھ تک تعداد پہنچ چکی تھی۔

کئی لاکھ انسانوں کی یہ قوم مصر سے نکلی، کن لوگوں کی نسل سے بنی تھی۔ اسی لڑکے کی نسل سے جو ہلاک کرنا چاہا تھا لیکن اس نے انہیں زندگی کی کامرانیاں بخش دیں۔ اس طرح اس عہد کی کرشمہ سازیوں کا ظہور شروع ہوگیا۔ جس کی بشارتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی یا پھر حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی ان کی تجدید ہوئی تھی۔ (صفحہ:220۔221)

3 اس کتاب کے باب 29 کا عنوان ہے ''حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' اور پہلا

ذیلی عنوان ہے ''اُمۃ وسطاً'' اس کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

اس بناء پر اعتدال کلی ودائمی کے لئے جس قسم کے الگ الگ افراط وتفریط کی ضرورت تھی اب وہ پوری ہوگئی اور قوانین ارتقاء جس جامع ومکمل مذہب کو ڈھونڈ رہے تھے اس کے ظہور کا وقت آ گیا پس زبان الٰہی نے اس متعدل امت کے پیدا ہونے کی بشارت دنیا کو سنا دی۔((وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا))(البقرۃ:143)

''اسی طرح ہم نے تم کو ایک عدل وتوسط کی قوم بنایا تا کہ تم لوگ دنیا میں نمونہ بنو اور پیغمبر تمہارے لئے نمونہ ہو۔''

داعی مذہب اسلام نے اس ''امۃ وسطاً'' کے لئے اپنا اعلیٰ نمونہ قائم کر دیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ ایک سخت طاقتور بادشاہ اور سخت جابر قوم کا مقابلہ کرنا تھا اس لئے اللہ نے ان کو فطرۃً پُرجلال بنایا تھا اسی لئے فرعون کے سامنے نرم کلامی کی تلقین کرنی پڑی لیکن پیغمبر اسلام خود ہی فطرۃً رحم وشفقت،کرم ورأفت، عفو درگزر کا خلق عظیم تھا۔

((فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ))

''یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے لئے فطرتاً نرم خو پیدا کیے گئے اگر تم سخت وسنگدل ہوتے تو لوگ تمہارے گرد جمع نہ ہوتے اور بھاگ جاتے۔''(آل عمران:159)

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قوم کی ذلت برداشت نہ ہوسکی اور وہ چند دنوں کے بعد اس کو لے کر چلے گئے لیکن پیغمبر اسلام نے کامل 13 برس تک اپنی قوم کے ہدایت یاب ہونے کا انتظار کیا طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں اور اپنے متبعین کو مختلف قسم کے جسمانی مصائب میں مبتلا دیکھا۔بایں اللہ نے ان کو صبر وسکون کا اعلیٰ ترین معیار بتلا دیا۔

((وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ))(الکھف:28)

''ان لوگوں کے ساتھ صبر کرو جو صبح وشام اللہ کی پکار میں سرگرم رہتے ہیں اور صرف اللہ کی مرضی تلاش کرتے ہیں اور اپنی نگاہ ان سے نہ پھیرو۔''

کفرزار مکہ کی ایک کنکری اس کے متبعین کوٹھوکر لگانا چاہتی تھی لیکن ان لوگوں نے داعی اسلام کے اسوۂ حسنہ کی اس عدیم النظیر طاقت کے ساتھ تقلید کی کہ ایک تنکے کو بھی نگاہ گرم سے نہ دیکھا بلکہ بعض موقعوں پر وہ کیا کہ اخلاق مسیحی اس کے آگے ہیچ ہے۔((وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا))[الفرقان:63]

''اور رحمٰن کے وہ بندے جو زمین پر آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور جب جہلاء ان کو نامعقول طریقے سے مخاطب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو، ہمیں اپنی راہ چلنے دو۔''(صفحہ:270-271)

4. باب نمبر39 کا عنوان ہے''حضرت مریم اور پیدائش مسیح علیہ السلام'' اس کے پہلے ذیلی عنوان''حضرت مسیح اور اللہ کا وعدہ'' کے تحت مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت اللہ کا وعدہ یہ تھا۔

1. میں تیرا وقت پورا کروں گا اور تجھے اپنی طرف اُٹھالوں گا۔
2. تیرے منکروں نے تیرے خلاف جو افترا بازیاں کی ہیں ان سے تیری پاکی آشکارا کروں گا۔
3. جو لوگ تیرے ماننے والے ہیں انہیں تیرے منکروں پر قیامت تک برتر رکھوں گا۔

عیسائیوں کی گمراہی کو حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا اعتقاد باطل پیدا کرلیا حالانکہ قوم بنی آدم کی طرح مسیح علیہ السلام بھی انسان تھے۔اور اللہ نے انہیں اپنی رسالت کے لئے چن لیا تھا۔ضمناً(قرآن مجید کا اشارہ)اس حقیقت کی طرف کہ اگرچہ مسیحی کلیسا نے صدیوں سے الوہیت مسیح کا اعتقاد قائم رکھا ہے اور تمام دنیا میں پھیل گیا ہے لیکن اس کے خلاف قرآن کی دعوت کامیاب ہوکر رہے گی کیونکہ یہ اعتقاد حقیقت کے خلاف ہے۔

دوسرے ذیلی عنوان''دعوت مباہلہ'' کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ

''عیسائیوں کو مباہلے کی دعوت کہ اگر انہیں الوہیت مسیح علیہ السلام کے اعتقاد پر یقین ہے تو پیغمبر اسلام ﷺ کے مقابلے پر آئیں اور دونوں فریق اللہ سے دعا مانگیں جو ناحق ہو، اس پر اللہ کی لعنت ہو، چنانچہ نجران کے عیسائی پیشواؤں کی جو جماعت مدینہ آئی تھی۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مباہلے کی

دعوت دی مگر انہیں مقابلے کی جرأت نہ ہوئی اور اطاعت کا اقرار کر کے وہ لوگ واپس چلے گئے۔''

تیسرا ذیلی عنوان ہے''رفع نزاع کی دوسری دعوت''اس کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ

''دعوت مباہلہ کے بعد رفع نزاع اور اتمام حجت کی دوسری دعوت اگر تمہاری مخالفت محض تعصب ونفسانیت کی وجہ سے نہیں اور دین حق پرستی کی کچھ بھی طلب باقی ہے تو آؤ اختلاف نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دیں اور توحید واللہ پرستی کی ان بنیادی صداقتوں پر متفق ہو جائیں جو خود تمہارے یہاں بھی مسلّم ہیں اگر چہ عملاً فراموش کر دی گئی ہیں یعنی

1. اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔
2. جو کچھ اس کے لئے ہے اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ رکھا جائے۔
3. کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنے لئے ایسا مقدس اور معصوم نہ بنائے گویا وہ اللہ ہے۔

توحید پرستی کا یہی طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا۔

چوتھا ذیلی عنوان ہے''ذمہ دار کون ہے''۔اس کے تحت مولانا لکھتے ہیں۔

''قیامت کے دن رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ جو احکام تم نے دیئے تھے تمہیں ان کا کیا جواب ملا یعنی جن قوموں کو دیئے گئے تھے اُنہوں نے کہاں تک ان پر عمل کیا۔اس سلسلے میں دعوت مسیح علیہ السلام کا ذکر اور ان سے مخاطبہ، پہلے اللہ نے وہ نعمتیں یاد دلائیں جو مسیح علیہ السلام کو دی گئی تھیں پھر فرمایا: تعلیم حق کی ان روشنیوں کے باوجود تیرے نام لیوا گمراہی میں پڑ گئے۔ تجھے اور تیری ماں کو اللہ بنالیا۔لوتھر کی اصلاح سے پہلے حضرت مریم علیہا السلام کی بھی پرستش کی جاتی تھی اور کیتھولک کلیسا اب بھی کر رہا ہے اس پر حضرت مسیح علیہ السلام عرض کریں گے میں اس سے بری ہوں۔''

مقصود یہ ہے کہ تمام داعیان حق نے خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دی لیکن پیروؤں نے انہی کی پرستش شروع کر دی اس گمراہی کے لئے پیرو ذمہ دار ہیں۔جن کی پرستش کی جاری ہے ان کا دامن اس سے پاک ہے۔(صفحہ:319-320)

شورش کاشمیری مرحوم اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی غلو سے خالی کہانی ملتی ہے بلکہ عبر وبصائر کے بعض واقعات جہد وعمل کا گنج

شائقگاں محسوس ہوتے ہیں۔[1]

اس کتاب کے (43) ابواب ہیں، صفحات کی تعداد (360) ہے۔ یہ پہلی بار 1972ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی۔

خصائص محمدیہ

یہ کتاب حافظ جلال الدین عبد الرحمان سیوطی (م 911ھ) کی کتاب "اللبیب فی خصائص الحبیب" کا ترجمہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ ترجمہ (12) سال کی عمر میں کیا اور یہ کتاب مطبوع ہے راقم کی نظر سے نہیں گزری۔

ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جن کا تعلق ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ مقالات کی تفصیل یہ ہے:

1 تذکار مقدس 2 ذکر مقدس 3 ماہ ربیع الاول کا اختتام 4 استفسار (مجلس مولد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

مولانا ابوالکلام کے یہ مقالات الہلال سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

اس کتاب کے ناشر میاں مختار احمد لکھتے ہیں:

''اس کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے بھی عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجبور ہو کر مسلمانوں کی اس روش کی بے راہ روی پر قلم اُٹھایا ہے بلکہ اپنے قلم کو تلوار بنا دیا ہے کیونکہ نبوت پر کسی حوالے سے گرد اڑانے والوں کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں۔ (صفحہ:9)

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

((وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ))

یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن نہ تھا، یہ عرب کی ترقی وعروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی، یہ محض قوموں کی طاقتوں کا اعلان نہ تھا، یہ صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے۔ بلکہ

---

[1] ابوالکلام آزاد، ص:385

اللہ کی ایک ہی اور عالمگیر بادشاہت کے عرش **جلال و جبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی**
(صفحہ:14)

تذکار مقدس:

((وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ)) ابر رحمت اور شادابی زمین

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

جب زمین پیاسی ہوتی ہے۔ رب السماوات والارض پانی برساتا ہے جب انسان اپنی غذا کے لئے بے قرار ہوتا ہے تو موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے جب خشک سالی کے آثار چھا جاتے ہیں تو آسمان رحمت پر بدلیاں چھا جاتی ہیں۔

((اللّٰهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ)) [الروم:48]

''وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہوائیں بادلوں کو اپنی جگہ سے ابھارتی ہیں اور جس طرح اس کی مرضی نے انتظام کر دیا ہے۔ بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے مینہ برسنے لگتا ہے اور تمام زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ پھر جب وہ اپنے بندوں پر جو بارش سے مایوس ہو گئے تھے پانی برسا دیتا ہے تو وہ کامیاب و خرم ہو کر خوشیاں منانے لگتے ہیں''۔(صفحہ:17)

امت مسلمہ کی تاسیس:

مولانا فرماتے ہیں:

''یہ امت مسلمہ کے ظہور کا پہلا دن تھا اور اس لئے کہ یہ حضرت ختم المرسلین و رحمت للعالمین محمد بن عبداللہ کی ولادت باسعادت تھی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

یہی واقعہ ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جو دعوتِ اسلامی کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہی ماہ ربیع الاول ہے

جس میں امت مسلمہ کی بنیاد پڑی۔جس کو تمام عالم کی ہدایت وسعادت کا منصب عطا ہونے والا تھا یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن نہ تھا۔ یہ عرب کی ترقی وعروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی، یہ محض قوموں کی طاقتوں کا اعلان نہ تھا، اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے۔اور جیسا کچھ کہ دنیا کی تمام تاریخ کا انتہائی سرمایہ ہے بلکہ یہ تمام عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا یہ تمام دنیا کی ترقی وعروج کے بانی کی پیدائش تھی یہ تمام کرۂ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا یہ تمام نوع انسانی کے شرف واحترام کا قیام عام تھا یہ انسانوں کی بادشاہت قوموں کی بڑائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ اللہ کی ایک ہی اور عالمگیر بادشاہت کے عرش وجلال وجبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔

پس یہی دن سب سے بڑا ہے کیونکہ اسی دن کے اندر دنیا کی سب سے بڑی بڑائی ظاہر ہوئی اس کی یاد نہ تو قوموں سے وابستہ ہے اور نہ نسلوں سے، بلکہ وہ تمام کرۂ ارضی کی ایک عام اور مشترک عظمت ہے جس کو وہ اس وقت تک نہیں بھلا سکتی جب تک کہ اس کی سچائی اور نیکی کی ضرورت ہے اور جب تک کہ اس کی زمین اپنی زندگی اور بقاء کے لئے عدالت وصداقت کی محتاج ہے۔(صفحہ:22-23)

ولادت باسعادت کے عنوان کے تحت مولانا فرماتے ہیں:

''پس دنیا اگر اپنی نجات کے لئے بے چین ہے تو اس کے لئے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے اس کا دکھ ایک ہی ہے۔اس لئے اس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔اس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو خشک وتر چمکاتا اور ایک ہی طرح بدلیوں سے اس کے آباد و ویرانہ کو شاداب کرتا ہے پس اس کی ہدایت ورحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور گو بہت سے ستارے اس کی روشنی سے اکتساب نور کرتے ہوں مگر ان سب کا مرکز ومبدأ نورانیت ایک ہی ہے۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو ''سراج'' کہا۔

((وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا))(النبأ:13)

''اور ہم نے آسمان میں سورج کے چراغ کو بڑا ہی روشن بنایا۔''

اور اسی طرح اس کے ظہور کو بھی ''سراج'' کہا، جس کی ہدایت ورحمت کی روشنی تمام کرۂ ارض کی ظلمتوں کے پیام صبح تھی۔

((يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا)) (الاحزاب:45-46)

''اے پیغمبر اسلام (ﷺ) ہم نے آپ کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا، سعادت انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لئے ایک نورانی چراغ بنا کر بھیجا۔(صفحہ:36-37)

ظہور و مقصد ظہور: عنوان کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ

''ماہ ربیع الاول کی یاد میں ہمارے لئے جشن و مسرت کا پیام اس لئے تھا کہ اسی مہینے میں اللہ کا وہ فرمان رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا، ظلم وطغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔اللہ اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا اور کلمہ کفر وضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی بادشاہت کا اعلان عام ہوا۔''

((قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ))

''اللہ کی طرف سے تمہاری جانب ایک نور ہدایت اور کتاب مبین آئی۔اللہ اس کے ذریعے اپنی رضا چاہنے والوں کو سلامتی اور زندگی کی راہوں پر ہدایت کرتا اور ان کے آگے صراط مستقیم کو کھولتا ہے۔''(المائدۃ:15-16)

لیکن دنیا شقاوت و حرمانی کے دور سے پھر دکھیا ہوگئ۔انسانی شر وفساد اور ظلم وطغیان کی تاریکی اللہ کی روشنی پر غالب ہونے کے لئے پھیل گئی۔سچائی اور راستبازی کی کھیتیوں نے پامالی پائی اور انسانوں کے بے راہ جگہ کا کوئی رکھوالا نہ رہا۔اللہ کی وہ زمین جو صرف اللہ ہی کے لئے تھی غیروں کو دے دی گئی اور اس کے کلمۂ حق و عدل کے غمگساروں اور ساتھیوں سے اس کی سطح خالی ہوگئی۔

((ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ))

''زمین کی خشکی اور تری دونوں میں انسان کی پیدا کی ہوئی شرارتوں سے فساد پھیل گیا اور زمین کی صلاح و فلاح غارت ہوگئی۔''(الروم:41)

پھر آہ! تم اس کے آنے کی خوشیاں تو مناتے ہو، مگر اس کے ظہور کے مقصد سے غافل ہو گئے ہو، اور وہ جس غرض کے لئے آیا تھا اس کے لئے تمہارے اندر کوئی چبھن نہیں۔

یہ ماہ ربیع الاول اگر تمہارے لئے خوشیوں کا اظہار ہے تو صرف اس لئے کہ اسی مہینے میں دنیا کی خزاں ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا موسم ربیع شروع ہوا پھر اگر آج دنیا کی عدالت سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے تو اے غفلت پرستوں تمہیں کیا ہو گیا ہے؟! کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے۔ (صفحہ:46-47)

مولانا آزاد ''یادگار حریت'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ

''تم ربیع الاول میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعویٰ رکھتے ہو، اور مجلسیں منعقد کر کے اس کی مدح وثناء کی صدائیں بلند کرتے ہو لیکن تمہیں کبھی بھی یہ یاد نہیں آتا کہ جس کی یاد کا تمہاری زبان دعویٰ کرتی ہے اس کی فراموشی کے لئے تمہارا ہر عمل گواہ ہے اور جس کی مدح وثناء میں تمہاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں اس کی عزت کو تمہارا وجود بٹہ لگا رہا ہے وہ دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ انسانوں کو انسانی زندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کی صراط مستقیم پر چلائے اور غلامی کی ان تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلائے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے انہوں نے اپنے پاؤں میں ڈال لئے تھے۔

((وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ إِصۡرَهُمۡ وَٱلۡأَغۡلَٰلَ ٱلَّتِي كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ))

''پیغمبر اسلام کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ گرفتاریوں اور بندشوں سے انسان کو نجات دلائے اور غلامی کے جو طوق انہوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں ان کے بوجھ سے انہیں رہائی بخشے۔'' (الاعراف:157)

اس نے کہا کہ ''اطاعت صرف ایک ہی کی ہے اور حکم وفرمان صرف ایک ہی کے لئے سزاوار ہے۔''

"إِنِ ٱلۡحُكۡمُ إِلَّا لِلَّهِ" (یوسف40)

''حکم واطاعت کسی کے لئے نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لئے۔'' (صفحہ:52-53)

اس کتاب کے پیش لفظ میں محترم احمد جاوید صاحب رکن اقبال اکادمی پاکستان لکھتے ہیں کہ

''ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک تحریری خطبہ ہے جس میں

مولانا ابوالکلام نے تفہیم اور تاثیر کو یکجان کر دیا ہے۔ یہ کتابچہ دراصل ایک اصلاحی خطاب ہے جس میں روئے سخن مسلمانوں کے اس طبقے کی طرف ہے جس نے حُبّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمانی تقاضے کو محض ایک رسمی شکل دے کر خود کو اُن ذمہ داریوں سے الگ کر رکھا ہے جو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری امت پر عائد ہوتی ہیں۔ مولانا ایک مصلح کی طرح جو اپنی اصلاح طلب قوم کی نفسیات سے خوب آگاہ ہے تمام خرابیوں کی فصاحت سے نشاندہی کرنے کے باوجود کہیں توہین وتحقیر کا رویہ اختیار نہیں کیا ہر جگہ ایک سچے خیرخواہ کے دلوزی سے کام لیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس دن کی یاد منانے والا ایک بڑا گروہ کیسی کیسی خرافات کا ارتکاب کرتا ہے شاید ہی کوئی عالم ہوگا جس نے ان خرافات کو رد نہ کیا ہو یا ان کی اصلاح کی کوشش نہ کی ہو۔ مولانا آزاد نے بھی یہی کہا ہے لیکن بالکل مختلف انداز میں، اکثر فقہاء اور محدثین کی طرح ایک لاتعلق ٹھنڈا اور تحکمانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے انہوں نے شفیق، فکرمند اور دیگر باپ کے لہجے میں کلام کیا ہے سخت سے سخت بات کہی مگر خود کو مخاطب سے دور نہیں کیا ڈانٹا بھی ہے تو چھاتی سے لگا کر ڈانٹا ہے۔ (صفحہ:11-12)

یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان میں کئی ناشروں نے شائع کی ہے مگر میرے پیش نظر مکتبہ جمال لاہور کا نسخہ ہے، جو 2008ء میں شائع ہوا ہے، صفحات کی تعداد 95 ہے۔